اقبال کے شعری مآخذ

مثنوی رومیؒ میں

سیّد وزیر الحسن عابدی
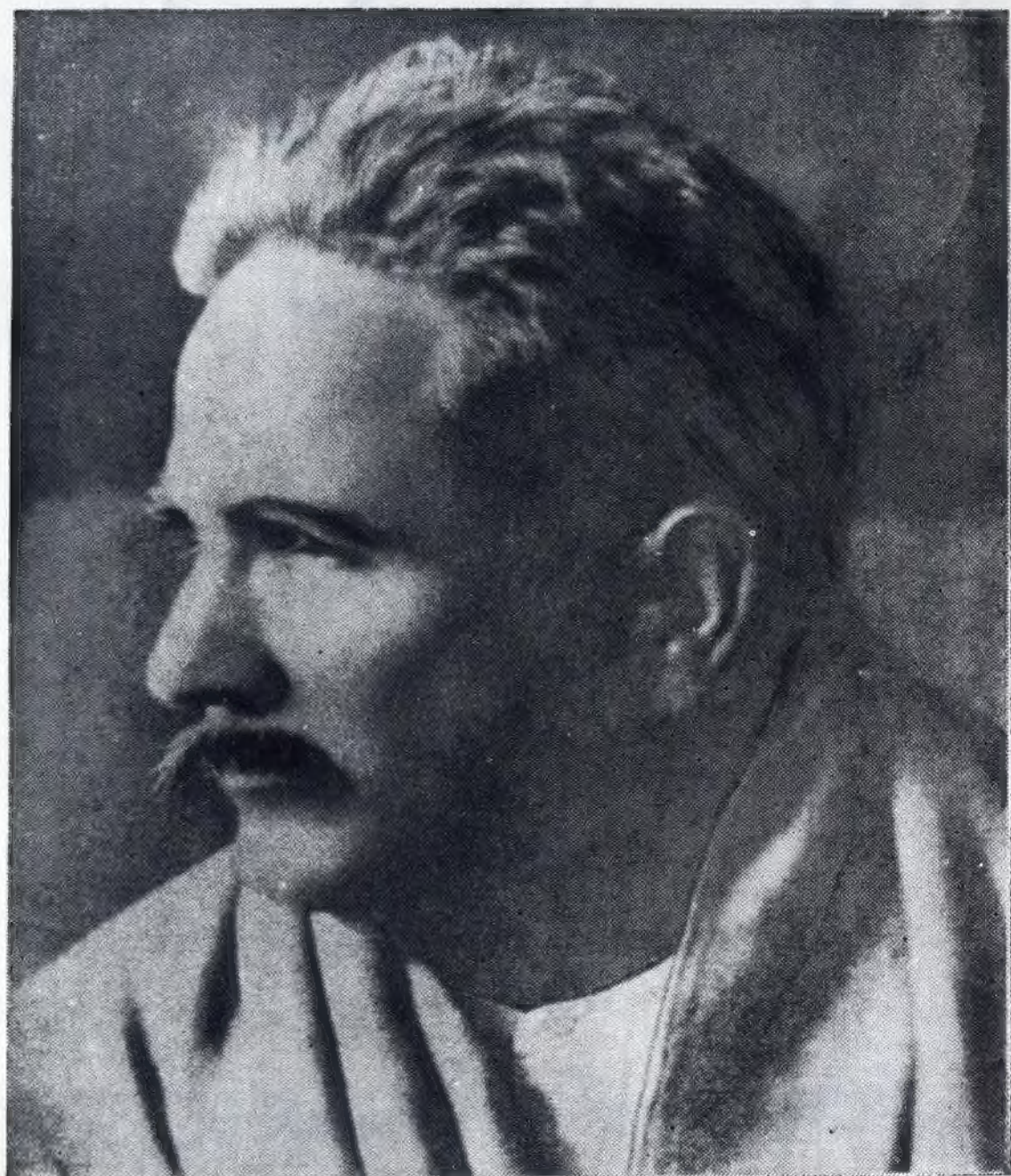
علاّمہ محمّد اِقبالؒ

(۱۸۷۷ — ۱۹۳۸)

اقبال کے شعری ماخذ

مثنوی رومیؔ میں

تالیف

سید وزیر الحسن عابدی

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبال

مجلسِ ترقیِ ادب - لاہور

طبع اول : نومبر ۱۹۷۷ع

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظمِ مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور

طابع : محمد زرین خاں

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

تقسیم کنندگان

اقبال اکادمی پاکستان
90/بی - 2 ، گلبرگ III ،
لاہور

مندرجات

☆ ☆ ☆

جہانِ کہنۂ نو کن

اقبال

چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ آخر زماں من[1]

رومی

ایہا العشّاق اقبالِ جدید
از جہانِ کہنۂ نو کن رسید
زاں جہاں کو چارۂ بیچارہ جوست
صد ہزاراں نادرۂ دنیا دروست

۱- ارمغان ، ص ۷۷ -

اَبشِروا یا قومُ اِذ جاءَ الفَرَج
اَفرِحُوا یا قومُ قد زالَ الحَرَج
آفتابی رفت در کازهٔ هلال
در تقاضا که ارِحنا یا بلال رض
زیرِ لب می گفتی از بیمِ عدو
کوریِ او بر مناره رو بگو
می دمد در گوشِ هر غمگین بشیر
خیز ای مدبر رهِ اقبال گیر[1]

۱- مثنوی : ۶ ، ص ۳۶۸ ، س ۳۶ تا ۳۹ -

دیباچہ

اقبال کے وہ شعری ماخذ کیا ہیں جن سے آن کے فلسفۂ خودی و بیخودی کے ترکیبی اجزا فراہم ہوئے ہیں ؟

اقبال نے اپنے معنوی مرشد مولوی رومی سے کیا استفادہ کیا ہے ، اور اس استفادے کے صحیح صحیح حدود کیا ہیں ؟ اقبال کی انفرادیت نے اس اخذ و اقتباس کی بنیاد پر اپنے زمانے کے تقاضوں کو نظر میں رکھتے ہوئے کس طرح کی پُرشکوہ اور حسین و جمیل عمارت تعمیر کی ہے ؟

اقبال کے فلسفیانہ کلام میں رومی کے کلام کے نقوش کس طرح نمایاں ہوئے ہیں اور اقبال کی عظیم انفرادیت نے رومی کے ارشادات کی نئی تعبیر و توجیہہ کہاں کہاں اور کن الفاظ میں کی ہے ؟ ان مسائل کے بارے میں مطالعہ کرنے والوں کے لیے ہم نے یہ کتاب ایسے نہج پر مرتّب کی ہے کہ اقبال و رومی کے مشترکہ کلام و پیغام کی ایک توضیحی موضوعاتی فرہنگ کے طور پر استعمال ہو سکتی ہے ۔

اس کتاب میں مثنوی رومی کے آن تمام مقامات کی کامل نشاندہی

اور آن قطعات کا حصر و احصا کیا گیا ہے جو اقبال کے افکار اور فلسفے پر اثر انداز رہے ہیں اور فلسفہ خودی و بیخودی کی شاعرانہ ترجمانی میں منعکس ہوئے ہیں۔

اقبال اور رومی کے کلام سے ضروری شواہد کی جامعیت کے ساتھ ساتھ کتاب کے حجم کو مناسب حدود میں رکھنے کے لیے صرف آن ابیات کو منتخب کر کے درج کیا گیا ہے جو متعلقہ مفہوم کی نشاندہی کے لیے کافی ہیں۔

ساتھ ہی تتبّع و تحقیق کرنے والوں کے لیے، جو مثنوی رومی میں ان شواہد کا سیاق و سباق دیکھنا چاہیں گے، حوالوں کا ایک ایسا اشاریہ مرتّب کر کے درج کیا گیا ہے جس کی مدد سے یہ اشعار مثنوی کے اس نسخے کے علاوہ، جس کے حوالے ہم نے حواشی میں دیے ہیں، دوسرے نسخوں میں بھی بآسانی مل سکتے ہیں۔

اشاریے سے معلوم ہوگا کہ اقبال کے شعری مآخذ کے دائرے میں مثنوی کے چھ کے چھ دفتر آ گئے ہیں۔

اس کتاب میں جو تقابلی شواہد پیش کیے گئے ہیں ان سے واضح ہے کہ اقبال نے مثنوی کے مطالب و معانی کو کیسی قوت و شدت سے اپنایا تھا کہ ان کے فلسفہ و پیغام اور زبان و بیان میں رومی کے حقائق و معارف کا پورے کا پورا سلسلہ ابھر آیا ہے اور فلسفۂ خودی و بیخودی کے سلسلۂ افکار کا پوری طرح ساتھ دیتا نظر آتا ہے۔ جہاں کہیں کچھ فرق ہے، اقبال کی طرف سے جدتِ تعبیر اور تفسیرِ مزید کا ہے، اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ:

اک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی

راقم الحروف کو طہران یونیورسٹی میں عصرِ حاضر کے عظیم رومی شناس استادِ مرحوم علامہ بدیع الزمان فروز انفر کے کلاس لیکچروں سے استفادے کا موقع نہ ملتا تو رومی کے بحرِ پُراسرار تک رسائی میسّر نہ آتی اور باوجود سالہا سال کے توسیعی مطالعے کے، جس کا سلسلہ بہت پہلے سے جاری رہا تھا، اس حقیقت کا درک نہ ہو پاتا کہ رومی کی مثنوی کیا ہے اور اس میں کیا کہا گیا ہے۔ میری خوش نصیبی تھی کہ یونیورسٹی میں ۱۹۴۷ع کے وسط سے ۱۹۵۲ع کے اوائل تک پانچ تعلیمی سال گزارتے ہوئے استادِ مرحوم سے تحصیل و اکتساب کا شرف حاصل رہا۔ مقّررہ نصاب کی تکمیل کے لیے میرا تحقیقی مقالہ اقبال اور رومی پر تھا جس کے لیے استادِ مرحوم ہی میرے رہنما تھے۔ زیرِ نظر کتاب اسی مقالے کی تشکیلِ نو ہے۔

اس تالیف میں چونکہ مثنویِ معنوی سے فکرِ اقبال کا رشتہ معیّن کرنا ہے اس لیے اقبال کے کلام سے بھی بنیادی طور پر فارسی اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ اُردو اشعار صرف چند مقامات پر ضمناً آ گئے ہیں۔ کلامِ اقبال سے شواہد کے انتخاب میں یہ اصول نظر میں رہا ہے کہ وہ اشعار ہوں جن کا اسلوبِ بیان مفہوم کی صراحت سے نسبتاً قریب تر ہے۔ ساتھ ہی یہ التزام بھی ملحوظ رہا ہے کہ ایسے اشعار ہوں جو اقبال کا مغربی مفکّرین سے رشتہ قائم کرتے ہوئے پیش کیے جاتے ہیں، تا کہ اس بارے میں متنازعہ فیہ حقائق کا جائزہ لیا جا سکے اور متخالف دعاوی کا فیصلہ ہو سکے۔

رومی کے کلام سے استشہاد تمام تر مثنوی پر مبنی ہے۔ دیوان کے اشعار صرف ایک دو جگہ ضرورتاً آ گئے ہیں۔

اقبال شناسی کے ادب میں اس ضرورت کو اب سے تقریباً انتیس سال پہلے محسوس کیا گیا تھا کہ اقبال اور رومی کے باہمی رشتوں کے بارے میں صحیح فیصلے کے لیے دونوں کے کلام سے تقابلی شواہد کا احصا ہونا چاہیے ۔ اقبال پر ایک اہم کتاب ''اقبالِ کامل'' میں ، جو دسمبر ۱۹۴۸ع میں شائع ہوئی ، مصنّف نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مقالے ''رومی ، نطشے اور اقبال'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا : ''افسوس ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم نے اس موقع پر اجمال سے کام لیا ہے ورنہ ضرورت یہ تھی کہ مولانا روم اور ڈاکٹر صاحب دونوں کے کلام سے بالمقابل شواہد پیش کیے جاتے ۔'' (مولانا عبدالسلام ندوی : اقبالِ کامل ، طبع اعظم گڑھ ، ص ۳۱۲) ۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ، راقم‌الحروف نے اس طرح کے مطالعے اور تحقیق کا آغاز ۱۹۴۷ع میں کیا تھا ۔ کتاب کا ابتدائی مسودہ گزشتہ تیس سال کی طویل مدت کے فواصل میں تہذیب و تجدید اور تشکیلِ نو کے مرحلوں سے گزرتا رہا ۔ اشاعت میں اس تاخیر کی یہ بہترین تلافی ہے کہ اب اس کتاب کو علامہ اقبال کی صد سالہ تقریباتِ ولادت کے تاریخی موقع پر مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور کے توسّط سے اقبال شناسوں کی خدمت میں پیش کرنے کی فضیلت حاصل ہو رہی ہے ۔

و ۔ ح ۔ ع

مقدمہ

''اقبال کے شعری مآخذ'' ـــ جیسا کہ دیباچے میں اشارہ کیا جا چکا ہے، عنوانِ کتاب کے ان الفاظ میں اقبال سے مراد فلسفۂ خودی و بیخودی کا شاعر اقبال ہے اور ظاہر ہے یہی وہ تصوّر ہے جو اقبال کے نام سے ذہنوں میں اُبھرتا ہے۔ اس بنا پر وہ اشعار کتاب کے موضوع سے خارج ہیں جن کا تعلق فلسفۂ اقبال کے اجزائے ترکیبی سے نہیں۔

شعری مآخذ سے مراد منظوم مآخذ ہیں، یعنی وہ اشعار جن سے اقبال نے اپنے فلسفے کی تشکیل کے لیے مضامین لیے، نیز وہ اشعار جن کے مطالب کو اقبال نے ابتدائی حوالہ گاہ بنا کر اپنے منفرد انداز میں حیات و کائنات کی ایسی فلسفیانہ تعبیر کی جو عصرِ حاضر کے تقاضوں پر محیط ہے۔

ظاہر ہے صرف مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی ہیں جن کا کلام اس خصوصیت کے ساتھ اقبال کا ماخذ بنا اور جن کی مثنوی مسلّم طور پر اقبال کے کلام و پیغام کا اصل سرچشمہ ہے۔

اس عظیم فلسفی شاعر کے بارے میں بات کرتے ہوئے مآخذ کا

اطلاق ہی صرف اُن ماخذ پر ہوتا ہے جو رومی کے افکار و اشعار اور کلام و پیغام میں ہیں - کتاب کے عنوان میں ذیلی الفاظ "مثنوی رومی میں" اصل عنوان کی توضیح کے طور پر ہیں -

موضوع کتاب کی اس حد بندی کی روشنی میں واضح ہے کہ تمام دوسرے شعرا کے اشعار کی تضمینیں اور انعکاسات ، جو اقبال کے کلام میں ملتے ہیں ، ماخذِ اقبال کے تحت نہیں آتے - ان کی نوعیت ضمنیاتِ کلام کی ہے - یہ چیزیں تلمیحاتِ اقبال کے وسیع تر عنوان کے ذیل میں آتی ہیں جو اس کتاب کا موضوع نہیں - اس طرح خود رومی سے متعلق وہ اشعار بھی کتاب کے حدود میں نہیں آتے جن میں صرف اظہارِ عقیدت و تحسین یا بیان واقع ہے ؛ رومی کا کوئی حکیمانہ مضمون نظم نہیں ہوا جیسے یہ چند اشعار :

بیـا کہ من ز خمِ پیرِ روم آوردم
مَیِ سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی است

(پیام ، ص ۱۹۷)

مرشدِ رومی حکیمِ پاک زاد
سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد

(پیام ، ص ۷)

روحِ رومی پردہ ہا را بردرید
از پسِ کُہ پارۂ آمد پدید

(جاوید ، ص ۱۳)

آگہی از قصۂ آخوندِ روم
آنکہ داد اندر حلب درسِ علوم

(اسرار، ص ۴۷)

اسی طرح رومی کے اشعار کی اس نوعیت کی تضمین یا تصرف کی صورت بھی خارج از موضوع ہے :

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران
گفتہ آید در حدیثِ دیگران

(اسرار، ص ۶۰)

در درونم نار و اندر سنگ نار
آب را بر نارِ من نبود گذار

(اسرار، ص ۶۸)

اقبال کے اس شعر میں :

شعلۂ درگیر زد بر خس و خاشاک من
مرشدِ رومی کہ گفت "منزلِ ما کبریا ست"

(پیام، ص ۲۰۴)

رومی کی ایک غزل کے اس شعر سے الفاظ لیے گئے ہیں :

خود ز فلک برتریم وز ملک افزون تریم
زین دو چرا نگذریم منزلِ ما کبریا ست

(دیوان، بیت ۴۹۱۳)

اقبال کے شعر میں ، جس سیاق میں یہ آیا ہے ، صرف بیانِ حال

مقصود ہے اس لیے یہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہمارے حدود
میں نہیں آتا ۔

غرض زیرِ نظر کتاب کا مقصد کلامِ اقبال میں رومی سے متعلق
تمام تلمیحات کی تشریح و تدریس نہیں ہے ۔ بنیادی مآخذ کی تلاش و
تحقیق مقصود ہے ۔

اقبال کے شعری مآخذ کے لحاظ سے رومی کی اہمیت پر برعظیم کے
دانشوروں نے کافی کچھ لکھا ہے ۔ یہاں ہم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب
کی ایک مبصّرانہ نگارش سے چند اہم اقتباسات درج کرتے ہیں :

"فکرِ اقبال کے مآخذ میں رومی کو سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل
ہے ۔ اقبال رومی کو اپنا ہادی اور پیشوا خیال کرتے ہیں اور
بار بار اعلان کرتے ہیں کہ میرے میکدے کی شراب در اصل
پیرِ روم کے خمستان کی حاصل کردہ ہے ۔ اقبال زندگی کے
اسرار کی نقاب کشائی کرتے ہیں ، مگر اس انکشاف کا سہرا اپنے
مرشد رومی کے سر باندھتے ہیں ۔"

(تشریحِ اقبال ، مقالہ مندرجہ مجموعہ آثارِ اقبال ، غلام دستگیر
رشید ، حیدرآباد دکن ، ۱۹۴۶ء) ۔

"یہ مولانا جلال الدین الرومی ہی ہیں جو اقبال کی نظر میں
کلیم بھی ہیں اور حکیم بھی ، مجدّد بھی ہیں اور مصلح بھی ،
شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی ہیں ، ولی بھی ہیں اور مجذوب بھی ،
طریقت کے دشوارگزار راستوں کے راہبر بھی ہیں اور حقیقت کے
مرحلوں کے ہادی بھی ، شریعت کے غوامض کے عقدہ کشا بھی
ہیں اور حکمت کے حقائق کے شارح بھی ۔ غرض اقبال کے نزدیک

ہماری "کرم خوردہ" ملّت کے تمام روحانی اور ذہنی امراض کو
شفا بخشنے والا رومی ہے، جس کی تعلیمات کو اقبال نے اپنے افکار
میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ استغراق اس
درجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو "مثیلِ رومی" قرار دیتے ہیں۔
ان کے نزدیک عہدِ قدیم میں رومی ملّت کے لیے پیغامِ حیات
لائے تھے اور اس پُر آشوب دورِ حاضر میں وہ خود اس کے
مبلّغ اور داعی ہیں۔" (ایضاً)

"اب تک جس قدر مضامین لکھے جا چکے ہیں ان میں اقبال اور
رومی کے مشترکہ خیالات پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔
جہاں تک مجھے معلوم ہے، شاید ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ہی
ایک ایسے شخص ہیں جنھوں نے اپنے مضمون "رومی، نطشے اور
اقبال" میں واضح طور پر آن خالص تصورات کو ظاہر کرنے
کی کوشش کی ہے جو اقبال نے رومی سے اخذ کیے ہیں۔ اسی
طرح چند اور بزرگوں نے بھی اشارتاً اور ضمناً اس بنیادی مسئلے
کی طرف توجہ کی ہے، لیکن اس مہتم بالشان بحث کے متعلق
یہ اختصار بالکل ناکافی ہے کیونکہ فکر رومی کی تجدید و ترویج
ہی علامہ اقبال کے مقاصدِ زندگی میں تھی۔" (ایضاً)

"اقبال کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے رومی کو نہ صرف
سمجھنا چاہیے بلکہ اس کو مقبولِ عام بنانا چاہیے۔" (ایضاً)

ماخذِ اقبال کی بحث میں ایک یہ مسئلہ بھی ہے کہ جو حقائق و
معارف رومی نے بیان کیے ہیں وہ رومی سے پہلے کے صوفیہ و حکماء کے
ادب میں موجود تھے اور ممکن ہے علامہ نے ان میں سے بعض چیزیں

اس ذخیرے سے براہِ راست لی ہوں جو رومی سے پہلے موجود تھا۔ اس سلسلے میں ہم اول تو یہ کہیں گے کہ زیرِ نظر کتاب کا موضوعِ بحث شعری ماخذ میں محدود ہے۔ دوسرے یہ کہ اقبال کے کلام میں بزرگانِ سلف کے اقوال سے استفادہ رومی کی وساطت سے ہوا ہے، یہاں تک کہ قرآن و حدیث[1] کے معانیِ عالیہ بھی اقبال نے بنیادی طور پر رومی ہی کے توسط سے لیے ہیں۔ رومی کی اس وساطت کا سراغ کلامِ اقبال کی ہیئت اور لفظیات سے ملتا ہے۔ ایسے مقامات کی نوعیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ دو مثالیں کافی ہوں گی:

مرسلان و انبیا آبائے او
اکرمِ او نزدِ حق اتقائے او

(رموز، ص ۱۲)

اقبال نے اس شعر کا مضمون سورۂ مبارکہ حجرات کی تیرھویں آیت سے لیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ صاحبِ تقویٰ ہو۔ یہ مضمون عام اسلامی معلومات کا ہے، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ رومی نے حکمتِ قرآنی کا یہ نکتہ اپنے اس شعر میں بیان

۱۔ ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مقالہ ''منابعِ مشترک حضرت مولاناؒ و علامہ اقبالؒ در آیاتِ مبارکۂ قرآنی و احادیثِ مقدسۂ نبوی'' مندرجہ مجموعۂ ارمغانِ دانشگاہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء۔

کیا ہے :

هر کہ در حمام شد سیماے او
هست پیدا بر رخِ زیباے او

(مثنوی : ۴ ، ص ۲۱۹ ، س ۳۸)

دونوں ابیات کی فنی ہیئت کا تطابق اور مفہوم کا توافق نشاندہی کرتا ہے کہ یہاں علامہ کی نظر میں مثنوی رومی کی یہ بیت ہے ۔

اسی طرح رومی کا یہ شعر :

با تو او چونست هستم من چنان
زیر پای مادران باشد جنان

(مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۳ ، س ۱۸)

بتا رہا ہے کہ علامہ نے مشہور حدیث ''الجنّة تحت اقدام امهاتکم'' سے اپنے اس شعر میں :

گفت آن مقصودِ حرفِ کن فکان
زیرِ پای امّہات آمد جنان

(رموز ، ص ۱۷۴)

استفادہ رومی کے توسّط سے کیا ہے ۔

یہی نہیں بلکہ حکمتِ مغرب میں بھی انھیں جہاں کہیں کوئی نکتہ ایسا ملتا ہے جو ضالّہٗ مومن کے تحت آتا نظر آتا ہے ، اسے وہ رومی کی تصویب و تائید سے قبول کرتے ہیں ۔ علامہ نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے :

''کل مثنوی مولانا روم دیکھ رہا تھا کہ یہ شعر نظر پڑا :

هر خیالے را خیالے می خورد
فکر ہم بر فکرِ دیگر می چرد

[مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۱ ، س ۱]

سبحان اللہ ! ایک خاص باب میں انھوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ باری تعالیٰ کے سوا ہر ہستی آکل و ماکول ہے ، اور اس ضمن میں شوپنہار (فلاسفر جرمنی) کے فلسفے کو اس خوبی سے نظم کر گئے ہیں کہ خود شوبن ہار کی روح پھڑک گئی ہوگی ۔''

[اقبالنامہ ، مجموعۂ مکاتیبِ اقبال ، مرتّبہٗ شیخ عطاء اللہ مرحوم ، حصۂ دوم ، لاہور ، ۱۹۵۱ع ، مکتوب بنام اکبر الہٰ آبادی ، شمارہ (۲۴) — (۱۱) ۔]

مغربی زبان و ادب اور فکر و فن کے جو اثرات اقبال کے کلام میں منعکس ہوئے ہیں ان کی تفصیلی نشاندہی کے لیے مغربیات کے ماہرین کی طرف سے مستقل تتّبع و تحقیق کی ضرورت ہے ۔ بے شک بعض مجازاتِ کلام ، ترکیبات و تعبیرات اور اسالیبِ بیان ، یہاں تک کہ اپنے عقاید و افکار اور تصوّرات اور نظریات کو پیش کرنے کے لیے ایک خاص ترتیب و انسجام میں اقبال نے مغربی امثال و نظائر سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ اگرچہ ''شاہین'' ، ''شاہباز'' ، ''شیر و شتر'' اور ''خون'' وغیرہ کی ہمارے ادب میں کمی نہیں ، اور خود رومی کے ہاں ان کی مثالیں موجود ہیں ، پھر بھی مجازات اور لفظیات کی سطح پر ہمیں نطشے اور دوسرے مغربی مصادر کے اثرات سے انکار کی

ضرورت نہیں ۔ ساتھ ہی کلام کے فنی پیکر میں اقبال کی اپنی ایجاد و اختراع اور انفرادیت بھی ایک مسلّم حقیقت ہے ۔

ہم نے مثنوی رومی سے جو اقتباسات پیش کیے ہیں وہ مثنوی کی ایک نہایت معتبر اشاعت ، طبع خاور سے لیے ہیں ۔ ان سے متعلق دو مسئلے قابلِ بحث ہیں : ایک مختلف نسخوں میں متن کے لفظی اختلافات کا مسئلہ ، دوسرا اشعار کی صحتِ انتساب کا ۔

اوّل تو ہمارے پیش کردہ شواہد کے حدود میں ایسے مقامات بہت ہی کم ہیں جہاں لفظی اختلاف اور نسخہ بدل کا وجود ہو ۔ دوسرے جہاں کہیں ایسا ہے بھی ، وہاں نسخہ بدل کی نوعیت الفاظ کے ترادف اور تقدیم و تاخیر اور اس طرح کی دوسری جزئی چیزوں تک محدود ہے جس سے نفس مضمون میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی جیسے 'قالب' کے بجائے 'پیکر' ، 'طعمہ' کے بجائے 'لقمہ' اور بالعکس ۔ یا بیت کے مصرعوں کی تقدیم و تاخیر وغیرہ ۔ ذیل کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی :

مثلاً یہ بیت ہے :

باده از ما مست شد نی ما ازو

قالب از ما هست شد نی ما ازو

اقبال نے یہ شعر اپنے تیسرے لیکچر[1] میں رومی کا حوالہ دے

---

1. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lahore, 1951, p. 71.

کر استعمال کیا ہے اور اس لیکچر میں یوں چھپا ہے :

پیکر از ما هست شد نے ما ازو

باده از ما مست شد نے ما ازو

اس کے علاوہ اقبال کے کلام میں بھی اسی طرح تضمین ہوا ہے۔ مسلّم طور پر رومی کا شعر ہے اور مثنوی کے تمام متداول مطبوعہ نسخوں میں شروع ہی میں تمہید کے اشعار میں ملتا ہے ، لیکن اس کے بارے میں علمی حلقوں میں کہیں کہیں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ یہ شعر الحاقی ہے۔ یہ غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ اہلِ تحقیق نے اس بیت کو تمہید کے اشعار میں الحاقی قرار دیا۔ چنانچہ نامی پریس کانپور کی نہایت نفیس اشاعت[1] میں اس بیت کو مثنوی کے آغاز میں درج نہیں کیا گیا ، جس سے عام قاری کو بادی النظر میں یہ تاثر ملا کہ یہ شعر رومی کا نہیں ہے ، حالانکہ اس نسخے کے حاشیے میں ضروری توضیح موجود ہے جس میں بتا دیا گیا ہے کہ تمہید کی ابیات کا یہ شعر نہیں ہے ، البتہ اسی پہلے دفتر میں آگے چل کر ایک دوسرے مقام پر آتا ہے۔ نہایت اہم کتاب ''مرآۃ المثنوی'' میں ، جو بہت مقبول اور مشہور ہوئی ، تمہید کے اشعار میں اس شعر کو قوسین میں درج کر کے نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ الحاقی ہے۔ اور چونکہ یہ کتاب مثنوی کی تلخیص تھی اور منتخب اشعار پر مشتمل تھی ، زیرِ بحث شعر پہلے دفتر کے اشعار میں جس دوسرے مقام پر آتا

۱- مثنوی مولوی معنوی ، طبع محمد رحمۃ اللہ ، نامی پریس کانپور ، سالِ طباعت غیر مذکور۔

ہے وہ انتخاب کے حدود میں نہ آ سکا۔ پھر جب پروفیسر نکلسن آنجہانی نے مثنوی کا تنقیدی متن مرتب کر کے شائع کیا جس کی پہلی جلد، جو دفتر اوّل و دوم پر مشتمل ہے، اسی سال یعنی ۱۹۲۵ع میں، جب ''مرآۃ المثنوی'' شائع ہوئی ہے، چھپ کر آئی تو اس میں ابتدائی اشعار میں یہ شعر نہ متن میں آیا، اور نہ حاشیے میں اس کے بارے میں کسی توضیح کی ضرورت سمجھی گئی، اس لیے کہ تمہید میں یہ شعر قطعاً الحاقی تھا اور قدیم معتبر نسخوں کے اختلافاتِ متن کے ذیل میں بھی نہیں آتا تھا۔

بہرحال نسخۂ نکلسن میں دفترِ اول کے صفحہ ۱۱۰ پر یہ شعر اس صورت میں ہے:

باده از ما مست شد نی ما ازو

قالب از ما هست شد نی ما ازو

طبع خاور، طہران میں بھی دفتر اول، صفحہ ۳۷ پر اسی طرح ہے۔ ان دونوں نسخوں میں اس بیت سے متعلق کوئی نسخہ بدل درج نہیں۔

دفتر اول میں یہ شعر اُس قطعے کے آخری اشعار میں ہے جس کا عنوان یہ ہے: ''تفسیر قول حکیم سنائیؒ، بهرچه از راه وامانی چه کفر آن حرف و چه ایمان الخ۔''

زیرِ نظر کتاب کے اشاریے میں ہم نے مطالعے کی سہولت کے لیے اس شعر کا حوالہ آغازِ دفتر کی بنیاد پر دیا ہے، اس بنا پر کہ تقریباً تمام متداول اشاعتوں میں یہ شعر شروع میں فوراً مل جاتا ہے، البتہ نسخۂ نکلسن میں شروع میں نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نول کشور کی اشاعت میں یہ شعر تمہید میں لفظ 'قالب' کے

ساتھ اور دفترِ اول میں دوسرے مقام پر اس کے بجائے لفظ 'عالم' کے ساتھ درج ہوا ہے۔ اس تحریر کے وقت مثنوی کا ایک اہم قلمی نسخہ ہمارے سامنے ہے جو جناب حکیم محمد نبی خاں صاحب جمال سویدا کے ذاتی کتب خانے کا ہے اور حکیم صاحب محترم نے ہمیں اس سے استفادے کی اجازت دی ہے۔ یہ نسخہ قطب الدین شاہ بہادر شاہ اول (مارچ ۱۷۰۷ع۔ اپریل ۱۷۱۳ع) کے چھٹے سالِ جلوس میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس کی کتابت عبدالواحد نے لاہور کے قیام کے دوران میں کی تھی۔ کتابت کی تکمیل کی تاریخ ۱۹ محرم ۱۱۲۴ھ (۲۷ فروری ۱۷۱۲ع) ہے۔ اس نسخے کے دوسرے کوائف کا ذکر چھوڑ کر ہم زیرِ بحث شعر کے بارے میں اس مقام پر یہ اشارہ ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ شعر تمہید کے اشعار میں اس نسخے میں بھی نہیں ہے اور دفتر اول میں دوسرے مقام پر لفظ 'قالب' کے ساتھ آیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا شعر ہے:

بر سماع راست هر تن چیر نیست

طعمهٔ هر مرغکے انجیر نیست

یہ شعر بھی متداول مطبوعہ نسخوں میں آغازِ مثنوی کے اشعار میں مذکورہ بالا شعر کے بعد آیا ہے، لیکن یہاں الحاقی ہے۔ اس کی صحیح جگہ دفترِ اول میں حسبِ ذیل عنوان کے اشعار میں ہے:

"فرق میان آنکه درویش است بخدا الخ"

مثنوی طبع خاور، طہران میں یہ شعر صفحہ ۵۶ پر پانچویں سطر میں ہے۔ یہاں اس میں 'تن' کے بجائے 'کس' اور 'طعمهٔ' کے بجائے لفظ 'لقمهٔ' ہے۔ "بالِ جبریل" میں پیرِ رومی اور مریدِ ہندی کے سوال و جواب کے ضمن میں یہ شعر استعمال ہوا ہے اور یہاں 'تن' کے بجائے لفظ 'کس'

کے ساتھ ہے ، البتہ 'لقمہ' کے بجائے 'طعمہ' لفظ آیا ہے۔ نسخہ نکلسن میں آغازِ دفتر میں یہ شعر شامل نہیں ، لیکن مذکورہ عنوان کے تحت درج ہے ، لفظ 'کس' اور لفظ 'لقمہ' کے ساتھ (دفتر اول ، ص ۱۷۰ ، بیت ۲۷۶۳) - نول کشور کی اشاعت میں اس شعر کا اندراج دونوں جگہ اسی طرح ہے جیسے طبع خاور ، طہران میں -

ذیل میں مثنوی کے ایسے بہت سے نسخوں کی اشاعت کی تاریخیں درج کی جاتی ہیں جو علامہ کی وفات سے پہلے تک پاکستان و ہند کے مختلف شہروں میں چھپتے رہے ہیں :

۱- لکھنؤ — ۱۲۵۲ھ (۳۸-۱۸۳۷ع) -

۲- مرتبہ وقار شیرازی (بخطِ وقار شیرازی) ، بمبئی — ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۷ع) -

۳- ایضاً بمبئی — ۱۲۶۳ھ (۳۸-۱۸۴۷ع) -

۴- مرتبۂ وقار شیرازی ، بمبئی — ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۴۹ع) (بخطِ محمد باقر اصفہانی/شیرازی) -

۵- ایضاً ، بمبئی — ۱۲۶۶ھ (۵۰-۱۸۴۹ع) - (بخطِ وقار شیرازی) -

۶- بمبئی — ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ع) -

۷- بمبئی — ۱۲۷۳ھ (۵۷-۱۸۵۶ع) -

۸- بمبئی — ۱۲۷۶ھ (۶۰-۱۸۵۹ع) -

۹- بمبئی — ۱۲۸۰ھ (۶۴-۱۸۶۳ع) -

۱۰- لکھنؤ — ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ع)[1] -

۱۱- بمبئی — ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶-۶۷ع) -

۱۲- لکھنؤ — ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ع) -

۱۳- لکھنؤ — ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴-۷۵ع) -

۱۴- دہلی — ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴-۷۵ع) -

۱۵- لکھنؤ — ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ع) -

۱۶- بمبئی — ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷-۷۸ع) -

۱۷- بمبئی — ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲-۸۳ع) -

۱۸- لکھنؤ — ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱-۹۲ع) -

۱۹- کانپور — ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲-۹۳ع) -

۲۰- بمبئی — ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲-۹۳ع) -

۲۱- لکھنؤ — ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶-۹۷ع) -

۲۲- کانپور — ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷-۹۸ع) -

۲۳- دہلی — ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷-۹۸ع) -

۲۴- بمبئی — ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷-۹۸ع) -

۲۵- بمبئی — ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰-۱۹۰۱ع) -

۲۶- کانپور — ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱-۱۹۰۲ع) -

۲۷- لکھنؤ — ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳-۱۹۰۴ع) -

۱- اس اشاعت سے صفحات کی جداگانہ ترتیب دفتر بہ دفتر شروع ہوئی اور نول کشور کی بعد کی اشاعتوں میں اسی نہج پر رہی - اس سے پہلے پوری مثنوی کی صفحہ بندی مسلسل تھی -

۲۸- مراد آباد — ۱۳۲۱ھ تا ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۳ع تا ۱۹۰۶ع)-
۲۹- لاہور — ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۷ع-۱۹۰۶ع)-
۳۰- لکھنؤ — ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۹-۱۹۰۸ع)-
۳۱- کانپور — ۱۳۳۱ھ (۱۳-۱۹۱۲ع)-
۳۲- کانپور — ۱۳۳۲ھ (۱۴-۱۹۱۳ع)-
۳۳- کانپور — ۱۳۳۵ھ (۱۷-۱۹۱۶ع)-
۳۴- بمبئی — ۱۳۴۰ھ (۲۲-۱۹۲۱ع)-
۳۵- دہلی — ۱۳۴۴ھ (۲۶-۱۹۲۵ع)-
۳۶- الہ آباد — ۱۳۴۵ھ (۲۷-۱۹۲۶ع)-

ان اشاعتوں میں چند ایک ایسی بھی ہیں جو ناقص رہیں؛ پورے چھ دفتروں کی طباعت نہ ہو سکی - بہرحال ان تمام اشاعتوں کے مطبوعہ دفتروں میں وہ سب ابیات موجود ہیں جن کا حوالہ ہم نے زیرِ نظر کتاب میں دیا ہے اور اس طرح ان شعری ماخذ کی سندیت ثابت ہے؛ یعنی یہ کہ اقبال نے مثنوی رومی کے جس متن سے اثرات قبول کیے ہیں، یہ سب اشعار مسلّماً اس متن کا جزو ہیں - لیکن پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آیا پروفیسر نکلسن کے مرتبہ تحقیقی متن کی اشاعت کے بعد، جس کی رو سے ان میں سے بہت سے اشعار الحاقی قرار پاتے ہیں، اقبال کے یہ شعری ماخذ رومی کے نقوشِ فکر ہیں یا نہیں - چنانچہ ہم نے ان تمام اشعار کا اس نقطۂ نظر سے بھی جائزہ لیا ہے اور ایک ایک حوالے کے بارے میں اچھی طرح تصدیق کر لی ہے کہ اس حیثیت سے بھی ان کی سندیت اور اصالت مسلّم ہے -

یہاں ضمنی طور پر یہ اشارہ ضروری ہے کہ مثنوی کے نام نہاد دفتر ہفتم کا ، جس کے راوی اسمٰعیل انقروی ہیں ، کوئی شعر ہمارے استناد کے دائرے میں نہیں آیا ہے ۔ یہاں اس دفتر کی تفصیلی بحث ہمارے مقصد سے خارج ہے ۔ اس دفتر میں ویسے کوئی نیا نکتہ بھی نہیں ہے ۔ اقبال و رومی کے الفاظ و معانی کا جو تقابلی مطالعہ ہم نے کیا ہے اس کی روشنی میں ہمارے لیے یہ واضح ہے کہ اقبال نے ساتویں دفتر کو کسی حیثیت سے بھی اپنے استفادے کا ماخذ نہیں بنایا ۔

پروفیسر نکلسن کے تحقیقی ایڈیشن کا دفترِ اول اور دفترِ دوم ایک جلد میں لائڈن میں ۱۹۲۵ع میں چھپا ، دفتر سوم و دفتر چہارم پر مشتمل جلد ۱۸۲۹ع میں اور دفتر پنجم و دفتر ششم کی جلد ۱۹۳۳ع میں شائع ہوئی ۔ علامہ کے فلسفۂ خودی کی تشکیل کو نکلسن کی جلد اول کی اشاعت سے پہلے گیارہ بارہ سال گزر چکے تھے ۔ انھوں نے اپنا فلسفۂ خودی انجمن حمایتِ اسلام کے ۱۹۱۴ع کے جلسے میں پیش کیا تھا[1] ۔ ذہنی طور پر اس فلسفے کی تشکیل وہ شاید اسی وقت سے شروع کر چکے تھے جب انھوں نے ۱۹۰۰ع میں الجیلی کے عقیدۂ وحدت الوجود پر مقالہ شائع کیا تھا[2] ۔ ''اسرارِ خودی'' ۱۹۱۵ع کی تصنیف ہے ۔ ''رموزِ بیخودی'' ۱۹۱۸ع میں مرتب ہو کر چھپی ، نکلسن کی جلد اول سے سات آٹھ سال پہلے ۔ ''پیامِ مشرق'' چار سال

۱۔ عبدالمجید سالک مرحوم : ذکرِ اقبال ، لاہور ، ۱۹۵۵ع ۔

۲۔ A Bibliography of Iqbal, K. A. Waheed کراچی ، ۱۹۶۵ع ۔

پہلے مرتّب ہوئی تھی - ''بانگِ درا'' کے مجموعے کی ترتیب ایک دو سال پہلے ہو چکی تھی - ''زبورِ عجم'' نکلسن کی اس جلد کے تقریباً دو سال بعد مرتّب ہو کر آنے والی تھی - ''تشکیل جدیدِ الٰہیات اسلامیہ'' کے چھ لیکچروں کا ہیولٰی ، جن میں ان کا پورا فلسفہ ہے ، نہ معلوم کب سے تیار ہو رہا تھا - ان خطبات کی ترکیبی نمود ۱۹۳۰ع میں ہوئی ، جس کے تین سال بعد نکلسن کی دفتر پنجم و دفتر ششم والی جلد چھپی ہے - خلاصہ یہ کہ اقبال کا رومی نکلسن کے متن سے بہت پہلے موجود تھا - لاہور میں اقبال کے زمانۂ طالب علمی سے شروع کریں تو ۱۸۹۵ع سے ، یعنی تیس سال پہلے سے ، ورنہ حق یہ ہے کہ میر حسن کی تدریس و تعلیم اور شیخ نور محمد کی تلقین و تربیت کے وقت سے موجود تھا ، اور یہ رومی مثنوی کے ان نسخوں کا رومی تھا جو انیسویں صدی کے سیالکوٹ اور لاہور میں متداول اور مقبول تھے - اقبال نے لاہور میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں گوجرانوالہ کے سوامی جی ، سوامی رام تیرتھ کو رومی کی مثنوی پڑھائی تھی[1] - یہ زمانہ ۱۸۹۵ع اور ۱۸۹۹ع کے درمیان کا ہے - پھر ۱۹۰۰ع میں اقبال نے پیرزادہ محمد حسین کی مثنوی ''عقد گوہر'' کے لیے پانچ تاریخی قطعات کہے جن میں رومی سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کیا اور ''عقدِ گوہر'' کی تصنیف کی تاریخ ''تلک آیات الکتاب'' سے

۱- مقالہ ''علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے'' نگارش ڈاکٹر عاشق حسین انبالوی ، مندرجہ کتاب ''آثارِ اقبال'' مرتّبہ غلام دستگیر رشید ، حیدرآباد دکن ، ۱۹۴۶ع ، صفحات ۶۴ ، ۶۵ -

نکالی[1] ۔ ''عقدِ گوہر'' مثنوی معنوی کے انتخاب کا منظوم اردو ترجمہ ہے ۔

اب ہم اصل موضوعِ بحث کی طرف آتے ہیں، یعنی مثنوی میں الحاقی ابیات کا مسئلہ، جس نے عصرِ حاضر میں پروفیسر نکلسن کے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد اہمیت حاصل کی ہے، یعنی ۱۹۲۵ع ، ۱۹۲۹ع اور ۱۹۳۳ع کے بعد[2] ۔ اس سے پہلے برِعظیم میں مثنوی کی طباعتوں کی بنیاد تین نسخوں پر تھی : ایک مولانا عبداللطیف گجراتی کا ''نسخہ ناسخہ مثنویات سقیمہ'' جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں شاہی سرپرستی میں اسّی نسخوں کے مقابلے سے مرتّب ہوا تھا، دوسرا وہ نسخہ جو اسمٰعیل انقروی کی تُرکی شرح کے ساتھ احمد آفندی نے بولاق (مصر) سے ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ - ۳۶ع) میں شائع کیا تھا اور پھر تبریز سے ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷-۵۸ع) میں اور استانبول سے ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۱-۷۲ع) میں شائع ہوا تھا، تیسرا مولانا احمد وقار بن وصال شیرازی کا مرتّبہ نسخہ جو پہلی بار ۱۸۴۷ع میں بمبئی سے شائع ہوا اور اپنے بعد کی تمام اشاعتوں کی

۱۔ ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مقالہ ''منابعِ مشترک حضرتِ مولاناؒ و علامہ اقبالؒ در آیات مبارکہٗ قرآن و احادیثِ مقدسہ نبوی'' مذکورۂ سابق ۔

۲۔ نکلسن کے ایڈیشن کی طباعت و اشاعت علامہ اقبال کی تجویز پر فیروز سنز لاہور کی طرف سے بھی (۱۹۲۶ - ۳۱ع) ہوئی تھی۔ یہ اس بنا پر کہ علامہ نے اپنے استاد پروفیسر نکلسن سے، جس زمانے میں وہ اپنا نسخہ مرتّب کر رہے تھے، اخلاقاً وعدہ کر لیا تھا کہ لاہور میں بھی اس کی اشاعت کا انتظام کرادیں گے ۔

بنیاد بنا ۔ نکلسن کے ایڈیشن کا اثر و نفوذ بروخیم (طہران) کی اشاعت (۱۷ - ۱۳۱۴ھ ش ، مطابق ۲۷ - ۱۹۲۶ع) سے شروع ہوا اور اب ایسے نسخے شائع ہونے لگے جن میں نکلسن کی تحقیق و تصحیح کے مطابق بہت سے اشعار الحاق قرار دے کر نکال دیے گئے ، یا علامت لگا کر ظاہر کر دیا گیا کہ الحاقی ہیں ، جیسے طبع خاور ، طہران (۱۳۱۹ - ۱۳۱۵ھ ش ، مطابق ۳۱ - ۱۹۲۷ع) ، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ نسخے بھی مقبول اور رائج رہے ، بلکہ زیادہ رائج رہے ، جن کی بنیاد نسخہ وقار شیرازی پر تھی ۔ ان نسخوں میں بہترین نسخہ وہ سمجھا جاتا ہے جو ''چاپ علاء الدولہ ، طہران'' کے نام سے مشہور ہے اور پہلی بار ۹۹ - ۱۲۹۸ھ ق (۸۲ - ۱۸۸۰ع) میں شائع ہوا ۔[1] زیرِ نظر کتاب میں موضوع کے شمارے اور صفحے کا حوالہ دے کر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں :

موضوع ۲ ، صفحہ ۶ ، ۷ ، نیز موضوع ۴۲ ، صفحات ۹۴ - ۹۵ :

هر کہ جویا شد بیابد عاقبت
سایۂ دردست اصل مرحمت

فرض کر لیں کہ یہ بیت الحاقی ہے ، لیکن جو بات یہاں کہی گئی ہے وہ رومی ہی کی ہے ، اور اس قطعے کے ان دو مصرعوں

۱- ان نسخوں کی کتابیاتی تفصیلات کا بیان کرنا یہاں مقصود نہیں ۔ بعض نسخے اعلیٰ طباعت اور نفاست کے لحاظ سے اہم ہیں ، جیسے میونخ (جرمنی) کا نسخہ ، جو ۱۴ - ۱۹۱۳ع میں شائع ہوا تھا ۔ ایسے نسخوں کا حال لکھنا بھی مقصود نہیں ۔

میں موجود ہے :

۱- ''تا بیابد طالبے چیزے کہ جست''

۲- ''ہر کجا دردے دوا آنجا رود''

پہلا مصرعہ اس شعر سے پہلے کی ابیات میں ہے ، دوسرا بعد کی بیت میں ۔

موضوع ۱۲ ، صفحات ۴۰ - ۴۱ :

آنکہ داند تو نشانش آن شناس

کو ز زوج این جہان دارد ہراس

اس سے پہلے یہ بیت ہے :

از ہزاران کس یکے خوش منظر است

کہ بداند کو بہ صندوق اندر است

اور اس کے بعد یہ :

آن جہان را دیدہ باشد پیش ازان

تابدان ضد این ضدش گردد عیان

اصل مضمون انھی دو ابیات میں ہے - زیرِ بحث شعر صرف ان کے باہمی ربط کی توضیح کر رہا ہے -

موضوع ۱۳ ، ص ۴۹ ، نیز موضوع ۱۴ ، ص ۶۵ ، نیز ۲۷ ، صفحات ۱۰۲ - ۱۰۳ :

عاملے را زان صلاح آمد ثمر

قومِ دیگر را فلاحِ منتظر

اصل مضمون اس سے پہلے کی حسب ذیل ابیات میں بیان ہوا ہے :

باز نان را زیرِ دندان کوفتند

گشت عقل و جان و فہم سودمند

باز آن جان چونکه محوِ عشق گشت
یعجب الزّراع آمد بعدِ گشت
باز آن جان چون بحق او محو شد
باز ماند از سکر و سوی صحو شد

زیرِ بحث شعر میں صرف وہ نتیجہ پیش کیا گیا ہے جو ان ابیات کے مضمون سے حاصل ہوتا ہے۔

موضوع ۱۳ ، ص ۵۷ :

علم جوئی از کتب ہائے فسوس
ذوق جوئی تو ز حلوائے سبوس

اس سے پہلے کی ابیات یہ ہیں :

تاجِ کرمناست بر فرقِ سرت
طوقِ اعطیناک آویزِ برت
جوہراست انسان و چرخ او را عرض
جملہ فرع و سایہ اند و تو غرض

بعد کی ابیات یہ ہیں :

اے غلامت عقل و تدبیرات و ہوش
تو چرائی خویش را ارزان فروش
خدمتت بر جملہ ہستی مفترض
جوہرے چون عجز دارد با عرض ؟
بحرِ علمے در نمے پنہان شدہ
در سہ گز تن عالمے پنہان شدہ

ظاہر ہے اصل مضمون ان شروع کی اور بعد کی ابیات میں ہے۔

زیرِ بحث شعر نکال بھی لیں تو قطعے کے حکیمانہ موضوع کا بیان اپنی جگہ مکمل رہتا ہے ۔ اس شعر کا مضمون ایک ضمنی اور فروعی بات ہے جو اصل کی تابع ہے ۔

موضوع ۱۹ ، صفحات ۸۰ ، ۸۱ :

خونِ ایشان خلق را باشد روا
زانکہ انسان را نیند ایشان سزا

قطعے میں یہ مضمون اس سے پہلے آ چکا ہے ۔ یہاں تاکیدِ مزید کے طور پر آیا ہے ۔ اس سے پہلے کا شعر یہ ہے :

خونِ آن ھا خلق را باشد سبیل
زانکہ وحشی اند از عقلِ جلیل

موضوع ۱۹ ، صفحات ۸۲ ، ۸۳ :

ھست این زنجیر از خوف و ولہ
تو مبین این خلق را بے سلسلہ

اس سے پہلے یہ شعر ہے :

خلق دیوانند و شہوت سلسلہ
میکشد شان سوے دکان و غلہ

بعد کے اشعار یہ ہیں :

میکشاند شان بسوے کشت و کار
میکشد شان سوے کانہا و بحار
میکشاند شان بسوے نیک و بد
گفت حق ''فی جیدھا حبل المسد''

جو مفہوم ان اشعار میں بیان ہوا ہے ، زیرِ بحث شعر اسی کے ایک

پہلو کی تکرار اور توضیح کر رہا ہے۔
موضوع ۴۶، ص ۱۵۵ :

مصلحت دادہ است هر یک را جدا
مصلحت جو، گر توئی مردِ خدا

اس سے پہلے کی ابیات ہیں :

چون نبی السیف بودہ است آن رسول
امّتِ او صفدرانند و فحول
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ

اصل بات ان دو ابیات میں آ گئی ہے۔ زیرِ بحث شعر میں اسی پیغام کی صراحت ہے جو ان ابیات میں مضمر طور پر موجود ہے۔

موضوع ۵۶، صفحات ۱۸۸، ۱۸۹ :

ذیل کے قطعے میں ابیات ۲ تا ۹ اور آخری بیت کو پروفیسر نکلسن نے الحاق قرار دے کر متن میں درج نہیں کیا، لیکن ایک اہم نسخے کی بنیاد پر حاشیے میں جگہ دی ہے :

در مقامے زهر و در جائے دوا
در مقامے کفر و در جائے روا

در مقامے خار و در جائے چو گل
در مقامے سرکہ، در جائے چو مُل

در مقامے خوف و در جائے رجا
در مقامے منع و در جائے عطا

در مقامے فقر و در جائے غنا
در مقامے قہر و در جائے رضا

در مقامے جور و در جائے وفا
در مقامے بخل و در جائے سخا

در مقامے درد و در جائے صفا
در مقامے خاک و جائے کیمیا

در مقامے عیب و در جائے ہنر
در مقامے سنگ و در جائے گہر

در مقامے حنظل و جائے شکر
در مقامے خشکی و جائے مطر

در مقامے ظلم و جائے محض عدل
در مقامے جہل و جائے عین عقل

گرچہ اینجا او گزند جان بود
چون بدانجا در رسد درمان بود

آب در غورہ ترش باشد ولیک
چون بہ انگورے رسد شیرین و نیک

باز در خم این شود تلخ و حرام
در مقام سرکگی نعم الادام

این چنین باشد تفاوت در امور
مرد کامل این شناسد در ظہور

جو مضمون پہلی بیت میں ادا ہوا ہے، بعد کی ابیات (۲ تا ۹)
میں اس کی توضیح اور تاکید مزید ہے اجمال کی تفصیل کے انداز

میں - رہی آخری بیت تو اس میں بھی اسی "تفاوتِ امور" کی صراحت اور اسی حقیقت کی اہمیت کا اظہار ہے جس کا بیان پہلی بیت میں ہو چکا -

موضوع ۵۸ ، ص ۱۹۸ :

ذیل کے قطعے کا آخری شعر الحاق قرار دیا گیا ہے :

این خریدارانِ مفلس را بهل
چه خریداری کند یک مشتِ گل !
گل مخر ، گل را مخور ، گل را مجو
زانکه گل خوار است دایم زرد رو
دل بجوتا دائما باشی جوان
از تجلّی چهره‌ات چون ارغوان
طالبِ دل شو که تا باشی چو مُل
تا شوی شادان و خندان همچو گل

دراصل یہ تیسرے شعر ہی کا مضمون ہے جو آخری شعر میں تاکیدِ مزید کے لیے جدّتِ بیان کے ساتھ ادا ہوا ہے -

موضوع ۵۸ ، ص ۲۰۱ :

فکرها کردند آن دانا گروه
کز زمین برکنده شد زان مکر کوه
کرده مکر و حیله آن قومِ خبیث
ور ز ما باور نداری این حدیث
کرد وصفِ مکرها شان ذوالجلال
لتزول منه اقلال الجبال

اس قطعے کا دوسرا شعر الحاق قرار دیا گیا ہے - یہ واضح ہے کہ قطعے کا اصل مفہوم پہلے اور تیسرے شعر میں ادا ہوا ہے - دوسرا شعر ان دونوں اشعار کے درمیان ربط کو واضح کر رہا ہے - اس شعر کے پہلے مصرعے میں وہی بات دہرائی گئی ہے جو قطعے کے پہلے شعر میں کہی جا چکی ہے -

موضوع ٦٥ ، صفحات ۲۳۲ ، ۲۳۳ :

ذیل کے قطعے میں ابیات ۳ تا ۱۰ کو الحاق قرار دیا گیا ہے ، لیکن واضح ہے کہ قطعے کا جو مضمون پہلی دو ابیات میں بیان ہو چکا ہے ان ابیات میں جدت بیان کے ساتھ اسی کی تکرار اور توضیح مزید ہے - یہی کیفیت گیارھویں بیت میں بھی ہے جو الحاق نہیں ہے - غرض الحاق کے امکانی دخل کے باوجود قطعے کا پورا پیغام رومی ہی کا رہتا ہے ، اور اس کے معانی کا کوئی پہلو مجروح نہیں ہوتا - رومی فرماتے ہیں :

از محبت تلخ ها شیرین شود
وز محبت مس ها زرین شود
از محبت دُردها صافی شود
وز محبت دردها شافی شود

اس سے آگے کے اشعار ہیں :

از محبت خارها گل می شود
وز محبت سرکہ ها مُل می شود

از محبت دار تختے می شود
وز محبت بار بختے می شود

از محبت سجن گلشن می شود
بے محبت روضہ گلخن می شود

از محبت نار نورے می شود
وز محبت دیو حورے می شود

از محبت سنگ روغن می شود
بے محبت موم آہن می شود

از محبت حزن شادی می شود
وز محبت غول ہادی می شود

از محبت نیش نوشے می شود
وز محبت شیر موشے می شود

از محبت سقم صحت می شود
وز محبت قہر رحمت می شود

از محبت مردہ زندہ می شود
وز محبت شاہ بندہ می شود

این محبت ہم نتیجۂ دانش است
کے گزافہ بر چنیں تختے نشست

دانشِ ناقص کجا ایں عشق زاد
عشق زاید نقص امّا بر جماد

تفصیلات یہاں ختم ہوئیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ اقبال کے انوارِ فکر کا آفتاب رومی کے آفق سے طلوع ہوا ہے، اور یہ ایک مسلّم حقیقت ہے جس کا اظہار مغربی محقّقین نے بھی کیا ہے۔ ان میں معاصر مصنّفین میں پروفیسر الیساندرو بوسانی خاص طور پر قابلِ ذکر

ہیں ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فکرِ اقبال کی شعاعیں اس اُفق کے کن کن زاویوں سے اُبھری ہیں ، کن سمتوں میں بڑھی ہیں اور زندگی کے کن میدانوں میں پھیلی ہیں ۔ زیرِ نظر صفحات اسی نوع کے تجزیاتی مشاہدات پر مشتمل ہیں اور یہ مطالعہ اور مشاہدہ اقبال کے اُن شعری مآخذ پر متمرکز ہے جو ہمارے ذہن کو اقبال کے فلسفے اور فکر سے قریب تر کرتے ہیں ، کسی خارج از مرکز تجسّس کی خاطر اصل ہدف سے دور نہیں لے جاتے ، کامل یکسوئی کے ساتھ ہمیں اقبال کے رومی اور رومی کے اقبال سے روشناس کراتے ہیں ۔

وزیر الحسن عابدی

یکم ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ
مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۷۷ء

این ۵۹ ، سمن آباد ، لاہور

فہرستِ موضوعات

(بنیادی اور ذیلی موضوعات)

☆ ☆ ☆

فہرستِ موضوعات

(ذیلی موضوعات)

☆ ☆ ☆

اختصارات

(تصانیفِ اقبالؒ)

ارمغان : ارمغانِ حجاز ، طبع نہم ، لاہور ، ۱۹۶۶ء -
اسرار : اسرارِ خودی ، اسرار و رموز ، (یک جا) ، لاہور ، طبع ششم ، ۱۹۶۴ء -
پس : پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ، مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر ، لاہور ، طبع ششم ، ۱۹۶۶ء -
پیام : پیامِ مشرق ، طبع یازدہم ، لاہور ، ۱۹۶۶ء -
زبور : زبورِ عجم ، طبع ہشتم ، لاہور ، ۱۹۶۶ء -
مسافر : مثنوی مسافر ، مذکورہ بالا -

(تصانیفِ مولانا جلال‌الدین محمد مولوی رومیؒ)

دیوان : دیوانِ کبیر (کلیاتِ شمس) با تصحیحات و حواشی علامۂ فقید مرحوم بدیع الزمان فروز انفر ، دانش‌گاہِ طہران ، ۱۳۴۴ھ ش -
مثنوی : مثنویِ معنوی ، کلالۂ خاور ، طہران ، ۱۳۱۶ھ ش -

☆ ☆ ☆

منتخب کتابیات

اقبال کی کتابیات کے مطبوعہ مجموعے موجود ہیں ، جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر یہ ہیں :

۱- A Bibliography of Iqbal, K. A. Waheed, Iqbal Academy, Pakistan, Karachi, 1965.

۲- کتابیاتِ اقبال ، رفیع الدین ہاشمی ، اقبال اکادمی ، لاہور ، ۱۹۷۷ء

۳- Theses on Iqbal, Syed Jamil Ahmad Rizvi, Aziz Publishers, Lahore, 1977.

مولانا جلال الدین محمد مولوی بلخی رومی کی کتابیات کے طور پر ہم ذیل میں چیدہ چیدہ کتابوں اور مقالوں کی نشان دہی کرتے ہیں :

(الف) مثنوی معنوی کی چند اہم اشاعتیں

۱- طبع بروخیم ، طہران : بہ تصحیح استاد سعید نفیسی ، ۱۳۵۴ھ ش -

(پروفیسر نکلسن کے تصحیح کردہ ایڈیشن اور بعض دوسرے نسخوں پر مبنی ، تین جلدوں میں) -

۲- طبع خاور ، طہران : بہ تصحیح محمد رمضانی ، ۱۳۱۹ھ ش -

۳- طبع علاءالدولہ ، طہران : باہتمام محمد طاہر کاشانی ، ۱۲۹۹ھ ق -

۴- نکلسن ایڈیشن ، لائڈن : آٹھ جلدیں ، ۱۹۲۵ع تا ۱۹۴۰ع - (جلد اول و سوم و پنجم میں متن ، جلد دوم و چہارم و ششم میں انگریزی ترجمہ اور جلد ہفتم و ہشتم میں تشریحات و تعلیقات ہیں) -

۵- طبع نولکشور ، لکھنؤ ، نیز کانپور (۱۹۰۸ع اور ۱۹۱۶ع کی اشاعتیں زیادہ عام ہیں) -

(ب) مثنوی کے خلاصے اور انتخاب

۱- بانگ نای ، سید محمد جمال زادہ ، طہران ، ۱۳۳۷ھ ش -

۲- خلاصۂ مثنوی ، تالیف آستاد علامہ بدیع الزمان فروز انفر ، طہران ، ۱۳۲۱ھ ش -

۳- Rumi, Poet & Mystic ، آر - اے ، نکلسن ، لندن ، ۱۹۵۰ع -

۴- لبِ لباب مثنوی ، مُلاّ حسین واعظ کاشفی ، طہران ، ۱۳۴۴ھ ش -

۵- مرآة المثنوی ، قاضی تلمّذ حسین ، حیدر آباد دکن ، ۱۳۵۲ھ ق -

۶- مقدمۂ رومی و تفسیر مثنوی معنوی ، رنالد الن نیکلسن ، ترجمہ و تعلیق ، اوانس اوانسیان ، دانشگاہِ طہران ، ۱۹۷۱ع -

(ج) مثنوی کی شرحیں

۱- اخلاقِ محسنی یعنی جواهر الاسرار و زواهر الانوار (فارسی)، کمال الدین حسین خوارزمی، تین جلدیں، نولکشور، لکھنؤ، ۱۳۱۲ھ ق -

۲- اشاراتِ ولوی، میرزا محسنِ عماد اردبیلی، طهران، ۱۳۳۷ھ ش -

۳- پیراهنِ یوسفی (اُردو) محمد یوسف علی شاه، نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۸۹ع -

۴- تفسیر معنوی بر دیباچۂ مثنوی، حسین کاظم زاده ایرانشهر، طهران، ۱۳۳۴ھ ش -

۵- شرح مثنوی (فارسی)، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم، بمبئی، ۱۳۴۰ھ ق -

(یہ شرح حاجی امداد الله مہاجر مکیؒ کے حواشی کے ساتھ طهران سے ۱۲۷۰ھ ق میں بھی چھپی تھی) -

۶- شرح مثنوی شریف، علامہ بدیع الزمان فروز انفر، دانشگاه طهران، ۱۳۴۶ تا ۱۳۴۸ھ ش -

(سہ جلد، شروع کی تین ہزار بارہ ابیات کی شرح) -

۷- شرح مثنوی مولانا رومی، مُلّا هادی سبزواری، طهران، ۱۲۸۵ھ ق -

۸- شرح مولانا رومی، مولوی ولی محمد اکبر آبادی، نولکشور، لکھنؤ، ۱۳۱۲ھ ق -

۹- کلیدِ مثنوی (اُردو)، مولانا اشرف علی تھانویؒ (طبع اول کے چوبیس اجزا مختلف مقامات سے چھپے: تھانہ بھون، کانپور، دہلی، ۱۹۰۳ تا ۱۹۲۰ع)۔

۱۰- لطائف المعنوی من حقائق المثنوی (فارسی)، مُلّا عبداللطیف عباسی، نولکشور، کانپور، ۱۸۷۶ع۔

۱۱- مفتاح العلوم، مولوی محمد نذیر عرشی، ۱۱ جلدیں، لاہور، ۱۳۶۳ھ ق۔

۱۲- مکاشفاتِ رضوی (فارسی)، مولوی محمد رضا، لکھنؤ، ۱۸۷۷ع۔

۱۳- المنہج القوی لطلاب المثنوی (عربی)، شیخ یوسف بن احمد المولوی، شش جلد، مصر، ۱۲۸۹ھ ق۔

۱۴- نثر و شرح مثنوی مولوی، شش جلد در سہ مجلد، موسیٰ نثری، طہران، ۱۳۲۷ھ ش۔

(د) مولانا کے کلیاتِ شمس تبریزی اور دوسری تصانیف کی اہم اشاعتیں

۱- دیوانِ غزلیاتِ شمس، باہتمام منصور مشفق، طہران، طبع دوم، ۱۳۳۵ھ ش۔
(اس اشاعت میں استاد بزرگوار جلال الدین ہمائی کا مقدمہ بے حد اہم ہے)۔

۲- رباعیات مولانا (صحیح ترین متن کلیات شمس، مرتبہٴ

استاد مرحوم بدیع الزمان فروز انفر کی جلد ہفتم میں ہے۔
ملاحظہ ہو ذیل میں شمارہ ۳ - جداگانہ اشاعتیں اسلامبول ، ۱۳۱۲ھ ق ، نیز ۱۳۱۴ھ ق کی ہیں) -

۳- کلیاتِ شمس یا دیوانِ کبیر ، بہ تحقیق و تصحیح استاد بدیع الزمان فروز انفر ، دہ جلد ، دانشگاہ طہران ، ۱۳۳۶ تا ۱۳۴۶ھ ش -

۴- فیہ ما فیہ ، بہ تصحیح استاد بدیع الزمان فروز انفر ، دانشگاہ طہران ، ۱۳۳۰ھ ش -

[اس سے پہلے کی اشاعتیں ہیں : شیراز ۱۳۱۸ھ ش ، (جلد دوم) ۱۳۳۲ھ ق ، (جلد اول) ۱۳۳۴ھ ق ، طہران ہر دو جلد ، ۱۳۳۹ھ ش اور اعظم گڑھ (طبع دوم) ۱۳۴۸ھ ق - مطبع معارف ، اعظم گڑھ سے مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم کا مرتّبہ نسخہ شائع ہوا تھا] -

۵- مجالسِ سبعۂ مولانا ، دکتر فریدون نافذبک ، اسلامبول ، ۱۳۵۴ھ ق ، نیز ۱۳۵۵ھ ق -

(مجالسِ سبعۂ مولانا ، مثنوی طبع خاور ، طہران کے ساتھ بھی شامل ہے) -

۶- مکتوباتِ مولانا ، دکتر فریدون نافذبک ، اسلامبول ، ۱۹۳۷ع -

(کتاب خانہ طہوری ، طہران سے فارسی مقدمے اور تعلیقات کے ساتھ ۱۳۴۰ھ ش میں ایک عمدہ نسخہ شائع ہوا) -

یادداشت : فیہ مافیہ ، مرتّبۂ استاد مرحوم بدیع‌الزمان فروز انفر

کا انگریزی میں ترجمہ کر کے پروفیسر اے - جے - آربری آنجہانی نے Discourses of Rumi کے عنوان سے لندن سے ۱۹۶۱ع میں شائع کیا -

(۵) علامہ بدیع الزمان فروزانفر کی دوسری تالیفات

(۱) کتابیں

۱- احادیثِ مثنوی ، دانش گاہ طہران ، ۱۳۳۴ھ ش - (طبع دوم ، امیر کبیر ، طہران ، ۱۳۴۷ھ ش) -

۲- رسالہ در تحقیقِ احوال و زندگانیِ مولانا جلال الدین محمد مشہور بہ مولوی ، طہران ، ۱۳۱۵ھ ش - (طبع دوم ، زوار ، طہران ، ۱۳۳۳ھ ش) -

۳- شرح احوال و نقد و تحلیل آثار شیخ فرید الدین عطّار نیشاپوری ، انجمنِ آثار ملّی ، طہران ، ۱۳۳۹ تا ۱۳۴۰ھ ش -

۴- مآخذِ قصص و تمثیلاتِ مثنوی ، دانش گاہ طہران ، ۱۳۳۳ھ ش -

۵- معارف ، تالیف برہان الدین محقّق ترمذی ، وزارتِ فرہنگ ، طہران ، ۱۳۴۰ھ ش -

۶- معارف ، مجموعۂ مواعظ و سخنان سلطان العلماء بہاء الدین محمد بن حسین خطیبی بلخی مشہور بہ بہاءِ ولد ، چہار جلد در دو مجلّد ، وزارتِ فرہنگ ، طہران ، ۱۳۳۳ تا ۱۳۳۸ھ ش -

(۲) مقدمات و مقالات و خطبات

۱- خواجه عبدالله انصاری و مولانا جلال الدین ، نشریه نهصدمین سال وفات خواجه ، کابل ، ۱۳۳۲ھ ش -

۲- شعرِ مولوی ، مقاله جزو مجموعهٔ یادنامهٔ مولوی ، مرتّبهٔ علی اکبر مشیر سلیمی ، کمسیون ملّی یونسکو در ایران ، طهران ، ۱۳۳۷ھ ش -

۳- مقدمه بر کتاب بانگ نای ، مرتّبهٔ سید محمد جمال زاده ، سابق الذکر -

۴- مقدمه بر تفسیر معنوی بر دیباچهٔ مثنوی ، تالیف کاظم زاده ایرانشهر ، سابق الذکر -

۵- مقدمه بر نخجیران ، بحثی دربارهٔ نخجیران و شیر و خرگوش از دفتر اول مثنوی معنوی مولوی ، امیر کبیر ، طهران ، ۱۳۳۷ھ ش -

۶- مقدمه بر طوطیان از دفتر اول مثنوی مولانا ، تالیف ادوارد ژوژف ، دانش گاه طهران ، ۱۳۳۹ھ ش -

۷- مثنوی ، بحثی دربارهٔ مثنوی ، برنامه مرزهای دانش ، رادیو طهران -

۸- مثنوی و کیفیت استفاده ازآن ، مجلهٔ خورشید ، طهران ، شماره ۱ ، ۴ ، ۱۱ تا ۱۳ -

(و) دوسرے مصنفین کی تالیفات

١- مقالہ: تحلیلِ یکی از تمثیلاتِ مثنوی ، نشریہ دانشکدہ ادبیاتِ تبریز ، شمارہ دہم ، دکتر منوچہر مرتضوی ، استاد دانشگاہ آذر آبادگان -

٢- تشبیہاتِ رومی ، دکتر خلیفہ عبدالحکیم ، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ، لاہور ، ١٩٥٩ع -

٣- التکشف عن مہات التصوف ، مولانا اشرف علی تھانویؒ ، دہلی ، ١٣٢٧ھ (نیز لاہور ، ١٩٦٠ع) -

٤- مقالہ: جلال الدین رومی ، مارگرت اسمیت ، مجلہ روزگار نو ، لندن ، جلد ٣ ، شمارہ ٣ -

٥- جذباتِ الٰہیہ ، اسداللہ ایزد گشسپ ، اصفہان ، ١٣١٩ھ ش - (کلیاتِ شمس کا انتخاب ، مقدمے ، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ) -

٦- جلوۂ حق ، ناصر مکارم شیرازی ، دارالفکر ، قُم ، ١٣٣٩ھ ش -

٧- حیات ، فلسفہ و آثار مولانا جلال الدین ، عبدالباقی گلپنارلی ، استانبول ، ١٩٥٢ع -

٨- حکمت رومی ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور ، ١٩٥٥ع -

٩- رسالہ در احوال مولانا جلال الدین مولوی ، فریدون بن سپہ سالار ، بہ تصحیح سعید نفیسی ، طہران ، ١٣٢٥ھ ش -

١٠- مقالہ : رومی و اطرافیانش ، Der Islam, H. Ritter ،
شمارہ ٧ ، ٨ ، ١٩٣٠ تا ١٩٣٢ع -

١١- سوانح عمری مولانا روم ، مولانا شبلی نعمانی ، لاہور ،
١٣٢٧ھ ق -

١٢- سیری در دیوانِ شمس ، علی دشتی ، کتابفروشی ابنِ سینا ،
طہران ، ١٣٣٧ھ ش -

١٣- شخصیت مولوی ، حسین شجرہ ، طہران ، ١٣١٦ھ ش -

١٤- صاحب المثنوی ، قاضی تلمّذ حسین ، اعظم گڑھ ، ١٩٦٧ع -

١٥- مقالہ : عشق از نظر مولانا جلال الدین ، نشریہ دانش کدہ
ادبیات تبریز ، شمارہ ٧ ، دکتر منوچہر مرتضوی ، استاد
دانش گاہ آذر آبادگان -

١٦- فرہنگ لغات و تعبیرات مثنوی ، چہار جلد ، دکتر صادق
گوہرین ، دانش گاہ طہران ، ١٣٣٧ تا ١٣٤١ھ ش -

١٧- لطائف اللغات ، مُلاّ عبداللطیف گجراتی ، نولکشور ، لکھنؤ ،
١٨٧٧ع - (یہ فرہنگ لندن میں بھی چھپی تھی اور مثنوی
طبع خاور ، طہران میں بھی شامل ہے) -

١٨- مقالہ : منابع مشترک مولانا و علامۂ اقبال در آیات مبارکہ
قرآنی و احادیث نبوی ، سید وزیرالحسن عابدی ، مندرجہ
مجموعہ ارمغان دانش گاہ ، دانش گاہ پنجاب ، لاہور ، ١٩٧١ع -

١٩- مناقب العارفین ، احمد افلاکی ، آگرہ ، ١٨٩٧ع ، کابل ،
١٣٤٠ھ ش -

۲۰- مولانای بلخی و پدرش ، میرمن محبوب سراج -
۲۱- مولوی چه می‌گوید ، استاد جلال الدین همائی ، به اقساط ، روزنامه پارس ، شیراز ، سال ۲۵۳۶ -
۲۲- مقاله : مولوی رومی و علامه شیرازی و داستان صدر جهان بخارائی ، عباس اقبال ، مجله مهر ، طهران ، شماره ۱ -
۲۳- مقاله : مولوی و طرزِ تفکرِ او در فلسفه ، ابوالقاسم رضوان کاشانی ، مجله ارمغان ، طهران ، شماره ۱۶ -
۲۴- مقاله : مولوی و شمس تبریزی ، دکتر محمد جعفر محجوب ، صدف ، طهران ، شماره ۱ -
۲۵- مقاله : نکاتی راجع به مولوی ، علی نقی شریعتمداری ، مجله دانشکده ادبیات ، جلد ۵ ، شماره ۱ -
۲۶- مقاله : نقد متن مثنوی ، علی نقی شریعتمداری ، مجله یغما ، طهران ، شماره ۱۲ -
۲۷- نی نامه ، استاد خلیل الله خلیلی ، افغانستان اکادیمی ، کابل ، ۱۹۷۳ع -
۲۸- ولد نامه (مثنوی ولدی) ، سلطان ولد ، به تصحیح استاد جلال الدین همائی ، کتابفروشی اقبال ، طهران ، ۱۳۱۵ه ش -
۲۹- یادنامهٔ مولوی ، علی اکبر مشیر سلیمی ، کمیسیون ملّی یونسکو در ایران ، طهران ، ۱۳۳۷ه ش -

(ز) بعض متفرق تالیفات ، انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں

1. Das Promium des Masnavi Mavlavi, H. Ritter, ZDMG, 29/1932.
2. Djelaleddine Roumi, Myriam Harry, Ernest Flammarion, Paris, 1947.
3. The Impact of Mowlana Jalaluddin Rumi on Islamic Culture, Dr. Afzal Iqbal, RCD Cultural Institute, Tehran, 1974.
4. The Life and Work of Mohammad Jalaluddin Rumi, Dr. Afzal Iqbal, Institute of Islamic Culture, Lahore, Third Revised Edition, 1974.
5. The Maulana and the West, Dr. Annemari Schimmel, an article in the Islamic Review, Woking, England. London 1956.
6. The Metaphysics of Rumi, Dr. Khalifa Abdul-Hakim, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 2nd Edition, 1943.
7. The Persian Mystic, Jalalud-Din Rumi, F. Hadland Davis, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1948.
8. Rumi the Persian, Rebirth in Creativity and Love, A. Reza Arasteh, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1965.
9. Rumi, Poet & Mystic, R. A. Nicholson, London, 1950.
10. Selected Poems from the Divani Shamsi Tabriz, R. A. Nicholson, Reprinted, London, 1952.
11. Studies in Islamic Mysticism, R. A. Nicholson, Cambridge, 1921.

متنِ کتاب

موضوعات

اشعارِ اقبال

اشعارِ رومی

توضیحات

حوالے

۱

آدم[۴] ـ قصّۂ آدم[۴] ـ گناہِ بشر

اقبال

زهره گرفتار من ، ماه پرستار من
عقلِ کلاں کار من بہرِ جہاں دار و گیر
گرچہ فسونش مرا برد ز راهِ صواب
از غلطم درگذر عذرِ گناهم پذیر
رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم
جز بکمندِ نیاز ، ناز نگردد اسیر
عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اهرمنِ شعلہ زاد سجده کند خاک را[۱]

چون بروید آدم از مشتِ گلے
با دلے ، با آرزوئے ، در دلے
لذتِ عصیاں چشیدن کارِ اوست
غیرِ خود چیزے ندیدن کارِ اوست

۱- پیام ، ص ۱۰۰ ، ۱۰۱ -

زانکہ بے عصیاں خودی ناید بدست
تا خودی ناید بدست ، آید شکست[۲]

رومی

این فضیلت خاک را زان رو دہیم
زانکہ نعمت پیشِ بے برگاں نہیم
زانکہ دارد خاک شکلِ اغبری
وز درون دارد صفاتِ انوری
ظاہرش با باطنش گشتہ بہ جنگ
باطنش چوں گوہر و ظاہر چو سنگ
ظاہرش گوید کہ ما اینیم و بس
باطنش گوید نکوبین پیش و پس
زین ترشرو خاک صورت ہا کنیم
خندۂ پنہانش را پیدا کنیم
زانکہ ظاہر خاک اندوہ و بکاست
در درونش صد ہزاراں خندہ ہاست
ظاہرش از تیرگی افغاں کناں
باطنِ او گلستاں در گلستاں[۳]

۲- جاوید ، ص ۲۱۲ و ۲۱۳ -
۳- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۲ ، س ۱۴ تا ۱۸ ، ۲۳ -

پس بصورت آدمی فرعِ جہاں
در صفت اصلِ جہاں ایں را بداں
ظاہرش را پشّہ آرد بچرخ
باطنش باشد محیطِ ہفت چرخ[۴]

آدمی چوں نور گیرد از خدا
ہست مسجودِ ملایک زاجتبا[۵]

آب و گِل خواہد کہ در دریا رود
گِل گرفتہ پاے او را میکشد
آں کشیدن چیست از گِل آب را
جذبِ تو نقل و شرابِ ناب را
ہم چنیں ہر شہوتے اندر جہاں
خواہ مال و خواہ آب و خواہ ناں
ہر یکے زانہا ترا مستی کند
چوں نیابی ، آں خمارت نشکند
ایں خمارِ غم دلیل آں شدہ است
کہ بداں مقصود مستی ات بدہ است

۴- مثنوی : ۴ ، ص ۲۷۶ ، س ۱۵ -
۵- مثنوی : ۲ ، ص ۹۹ ، س ۳۷ -

جز باندازه ضرورت زیں مگیر
تا نگردد غالب و بر تو امیر[6]

ور نمی تانی کہ کل عریاں شوی
جامہ کم کن تا رہِ اوسط روی
گفت ، راہِ اوسط ارچہ حکمت است
لیکن اوسط نیز هم بانسبت است[7]

توضیحات :

اقبال نے انسان کے ارتکابِ گناہ کی توجیہ میں اس کے ''مشتِ گل'' (۲) ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ رومی کے اشعار میں اس مفہوم کے لیے ''خاک'' (۶) اور ''آب و گل'' (۶) کا ذکر تفصیل سے ہے ۔ حصولِ خیر کو اس بحث میں اقبال نے ''ناز'' (۱) کہا ہے ، رومی نے ''نعمت'' (۳) ۔ یہاں لفظ ''ناز'' ''نعمت'' کا مترادف ہے ۔ اقبال نے انسانی فطرت کے تقاضے اور احتیاج کو گناہ کا محرّک قرار دیتے ہوئے اسے نیاز (۱) سے تعبیر کیا ہے ۔ رومی کے بیان میں انسان کی بے برگی (۳) کا مفہوم یہی ہے ۔ اس کے علاوہ اقبال نے جو مفہوم ''لذتِ عصیاں'' (۲) کہہ کر ادا کیا ہے وہ رومی کے کلام میں ''نقل و شرابِ ناب'' کے استعارے سے ادا ہوا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۶- مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۳ ، س ۱۳ - ۱۶ ۔
۷- مثنوی : ۲ ، ص ۱۳۲ ، س ۳۳ ، ۳۷ ۔

۲

آرزو ۔ ارادہ و آرزو کی اہمیت

اقبال

چیست اصلِ دیدۂ بیدار ما
بست صورت لذتِ دیدار ما

کبک پا از شوخیِ رفتار یافت
بلبل از سعیِ نوا منقار یافت

بینی و دست و دماغ و چشم و گوش
فکر و تخئیل و شعور و یاد و ہوش

زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت
بہرِ حفظِ خویش ایں آلات ساخت[1]

۱۔ اسرار، ص ۱۷ ۔

رومی

زانکہ بے حاجت خداوندِ عزیز
می نبخشد هیچ کس را ، هیچ چیز
گر نبودے حاجتِ عالم ، زمیں
نافریدے ، هیچ رب العالمیں
ویں زمینِ مضطرب محتاج کوه
گر نبودے نافریدے پر شکوه
ور نبودے حاجتِ افلاک هم
هفت گردوں نافریدے از عدم
پس کمندِ هستها حاجت بود
قدرِ حاجت مرد را آلت بود
پس بیفزا حاجت ، اے محتاج ، زود
تا بجوشد از کرم دریاے جود[۲]

هر چہ روئید از پیِ محتاج رست
تا بیابد طالبے چیزے کہ جست
حق تعالیٰ کایں سماوات آفرید
از برائے رفعِ حاجات آفرید

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۹ ، س ۱۳ تا ۱۶ -

هر کہ جویا شد بیابد عـاقبت
مـایۂ در دست اصـلِ مرحمت
هر کجا دردے ، دوا آنجا رود
هر کجـا فقرے ، نوا آنجـا رود
هر کجا مشکل ، جواب آنجا رود
هر کجا پستیست ، آب آنجا رود
زرعِ جانرا کش جواهر مضمر است
ابرِ رحمت پر ز آبِ کوثـر است[۳]

زانکہ ظاهر خاک اندوہ و بکاست
در درونش صد هزاراں قندهاست
ظاهرش از تیرگی افغاں کناں
باطنِ او گلستاں در گلستاں[۴]

پس بہ صورت آدمی فرعِ جہاں
در صفت اصلِ جہاں ایں را بداں
ظـاهـرش را پشـّۂ آرد بچرخ
بـاطنش بـاشد محیطِ هفت چـرخ[۵]

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۹ ، س ۳ تا ۵ ، ۷ -
۴- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۲ ، س ۱۸ ، ۲۳ -
۵- مثنوی : ۴ ، ص ۲۷۶ ، س ۱۵ -

قالب از ما هست شد ، نے ما ازو
باده از ما مست شد نے ، ما ازو[6]

آدمی چوں نور گیرد از خدا
هست مسجودِ ملایک زاجتبا[7]

پس به صورت عالمِ اصغر توئی
پس به معنی عالمِ اکبر توئی
ظاهرا آں شاخ اصلِ میوه است
باطناً بهرِ ثمر شد شاخ هست
گر نه بودے میل و آمیدِ ثمر
کے نشاندے باغباں بیخِ شجر
پس بمعنی آں شجر از میوه زاد
گر به صورت از شجر بودش نهاد
گر به صورت من ز آدم زاده ام
من بمعنی جدِّ جدّ افتاده ام
پس ز من زائیده در معنی پدر
پس ز میوه زاد در معنی شجر[8]

۶- مثنوی : ۱ ، ص ۲ ، س ۱۳ -
۷- مثنوی : ۲ ، ص ۹۹ ، س ۳۷ -
۸- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۴ ، س ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۵ -

جوہر است انسان و چرخ اورا عرض
جملہ فرع و سایہ اند و تو عرض[۹]

توضیحات :

یہاں اقبال کے اسلوبِ بیان میں ''لذتِ دیدار''(۱) ''صورت''(۱) کے وجود پر مقدّم ہے ، ''شوخیِ رفتار'' (۱) ''پاے کبک'' (۱) کے وجود پر اور بلبل کی ''سعیِ نوا'' (۱) ''منقار'' (۱) کے وجود پر - یہ رومی کے انداز بیان کی پیروی ہے :

قالب از ما ہست شد ، نے ما ازو
بادہ از ما مست شد ، نے ما ازو (٦)

یعنی انسان کا وجود مقدّم ہے اس کے جسم کے وجود پر - انسان کا وجود علّت ہے ، جسم معلول - میخوار کے وجود نے مے اور نشۂ مے کو وجود بخشا ہے - اسی طرح (۸) کے تحت اشعار میں رومی نے کہا ہے کہ درخت کا وجود دراصل میوے کے وجود کا مرہون منّت ہے - اقبال نے ارتقاے حیات کی اصل ، سعی و آرزو کو قرار دیا ہے - رومی نے انسان کو مخاطب کر کے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے : ''پس بیفزا حاجت'' (۲) -

☆ ☆ ☆

۹- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۹ ، س ۱۵ -

۳

ابلیس - انکارِ ابلیس - گناہِ ابلیس

اقبال

*در گذشتم از سجود اے بے خبر
ساز کردم ارغنونِ خیر و شر
من ، بلے ، در پردۂ لا گفتہ ام
گفتۂ من خوشتر از ناگفتہ ام
تا نصیب از دردِ آدم داشتم
قہرِ یار از بہرِ او نگذاشتم[1]

رومی

من سبب را ننگرم کو حادث است
زانکہ حادث حادثے را باعث است

---

*از قولِ ابلیس -

۱- جاوید ، ص ۱۵۸ -

لطفِ سابق را نظاره می کنم
وانچه او حادث دوباره می کنم

ترکِ سجده از حسد کردم که بود
این حسد از عشق خیزد ، نے جحود

این حسد از دوستی خیزد یقین
که شود با دوست غیرے همنشین[۲]

خاصه رندے چون تو قطاع الطریق
از چه رو گشتی چنین بر من شفیق

گفت ما اوّل فرشته بوده‌ایم
راه طاعت را بجان پیموده ایم

سالکانِ راه را محرم بدیم
ساکنانِ عرش را همدم بدیم

ما هم از مستانِ این مے بوده ایم
عاشقانِ درگہِ وے بوده ایم

پیشهٔ اوّل کجا از دل رود
مهرِ اوّل کے ز دل زایل شود[۳]

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۹ ، س ۲۹ - ۳۱ -
۳- مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۹ ، س ۱۶ و ۱۸ - ۲۰ -

توضیحات :

اقبال کے تیسرے شعر میں ''درد آدم'' (۱) سے مراد ہے عشقِ الٰہی جو آدم[۴] کو ودیعت ہوا ۔ رومی کے اشعار میں عین یہی بات کہی گئی ہے ۔ ابلیس کہتا ہے :

ترک سجدہ از حسد کردم کہ بود
ایں حسد از عشق خیزد نے جحود(۲)

نیز رومی کے اس شعر میں :

ما ہم از مستانِ ایں مے بودہ ایم
عاشقانِ درگہِ وے بودہ ایم(۳)

''مے'' سے مراد ''عشق'' ہے ۔

جو نکتہ اقبال کے تیسرے شعر میں ''قہریار'' (۱) میں مضمر ہے اس پر غالب کے اس شعر سے روشنی پڑتی ہے :

ملتی ہے خوے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں[۵]

۴

ابلیس ۔ ابلیس کی اہمیت

اقبال

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
که یزداں دارد و شیطاں ندارد[1]

بزم با دیو است آدم را وبال
رزم با دیو است آدم را جمال
خویش را بر اہرمن باید زدن
تو همه تیغ ، آں همه باشد فسن[2]

رومی

چوں عدو نبود ، جہاد آمد محال
شہوت ار نبود ، نباشد امتثال
صبر نبود ، چوں نباشد میلِ تو
خصم چوں نبود ، چه حاجت خیلِ تو

۱- پیام ، ص ۱۵۴ -
۲- جاوید ، ص ۱۸۶ -

ھین مکن خود را خصی ، رھبان مشو
زانکہ عفّت ہست شہوت را گرو
بے ھوا نہی از ھوا ممکن نبود
ھم غزا بر مردگاں نتوان نمود[۳]

توضیحات :

اقبال نے جس بنیاد پر ''کور ذوق'' (۱) کہا ہے ، رومی نے بالکل اسی بنیاد پر ''مردہ' (۳) کی مثال دی ہے ۔ دونوں لفظ محرومی کا پتا دیتے ہیں ۔

☆ ☆ ☆

۳۔ مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۸ ، س ۱٦ ۔ ۱۸ ۔

۵

اختیار - جبر و اختیار

اقبال

گفت یزدان که چنین است و دگر هیچ مگو

گفت آدم که چنین است و چنان می بایست[1]

سینهٔ آزادهٔ چابک نفس

طائرِ ایّام را گردد قفس

عهد را ایّام زنجیر است و بس

بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس

همّتِ حر با قضا گردد مشیر

حادثات از دستِ او محدث پذیر

رفته و آینده در موجودِ او

دیرها آسوده اندر زودِ او

۱- زبور ، ص ۲۹۲ -

نکتهٔ غیب و حضور اندر دل است
رمزِ ایّام و مرور اندر دل است[۲]

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی
دارای جهان را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقیں درکش و از دیرِ گماں خیز[۳]

رومی

لفظِ جبرم عشق را بے صبر کرد
وانکہ عاشق نیست حبسِ جبر کرد
ایں معیت با حق است و جبر نیست
ایں تجلّیِ مہ است ، ایں ابر نیست
ور بود ایں جبر ، جبرِ عامہ نیست
جبرِ آں امّارۂ خودکامہ نیست
جبر را ایشاں شناسند اے پسر
کہ خدا بکشاد شاں در دل بصر[۴]

گر قضا پوشد سیہ ہمچوں شبت
ہم قضا دستت بگیرد عاقبت

۲- اسرار ، ص ۸۳ -
۳- زبور ، ص ۱۱۸ -
۴- مثنوی : ۱ ، ص ۳۱ ، س ۲۹ - ۳۰ -

گر قضا صد بار قصدِ جاں کند
ہم قضا جانت دہد ، درماں کند
ایں قضا صد بار گر راہت زند
بر فرازِ چرخ خرگاہت زند۵

توضیحات :

اقبال نے جبر و اختیار کی حقیقت بیان کرتے ہوئے تقدیرِ "یزداں" (۱) کے ساتھ تدبیرِ "آدم" (۱) کی وسعتوں کی طرف اشارہ کیا ہے - بندۂ آزاد کی "ہمّت" (۲) کو قضا و قدر کا "مشیر" (۲) بتایا ہے ، اور انسان کو "دارای جہاں" (۳) کا "یمین و یسار" قرار دیا ہے - اسی نکتے کو رومی نے "معیت با حق" (۴) کے الفاظ میں ادا کیا ہے ، اور جو مرتبہ انسان اپنی سعی و تدبیر سے حاصل کر سکتا ہے اس کی نشان دہی یہ کہہ کر کی ہے :

بر فراز چرخ خرگاہت زند (۵)

اقبال نے انسان کے اختیار اور انسان کے ممکنات کے تحقّق کا راز یوں بتایا ہے :

راز ایّام و مرور اندر دل است (۲)

رومی نے اسی جبر و اختیار کی بحث کے ضمن میں کہا ہے :

جبر را ایشاں شناسند اے پسر
کہ خدا بکشاد شاں در دل بصر(۴)

☆ ☆ ☆

۵- مثنوی : ۱ ، ص ۲۷ ، س ۲۹ - ۳۰ -

٦

اختیار - جبر و قدر

اقبال

چہ گویم از چگون و بے چگونش
بروں مجبور و مختار اندرونش
چنیں فرمودۂ سلطانِ بدر است
کہ ایماں درمیانِ جبر و قدر است
تو ہر مخلوق را مجبور گوئی
اسیرِ بندِ نزد و دور گوئی
ولے جاں از دمِ جاں آفرین است
بچندیں جلوہ ہا خلوت نشین است
ز جبرِ او حدیثے درمیاں نیست
کہ جاں بے فطرتِ آزاد جاں نیست
شبیخوں بر جہانِ کیف و کم زد
ز مجبوری بہ مختاری قدم زد

چو از خود گردِ مجبوری فشاند

جهانِ خویش را چون ناقہ راند

نگردد آسماں بے رخصتِ او

نتابد اخترے بے شفقتِ او[1]

روسی

اختیارے ہست ما را در جہاں

حس را منکر نتانی شد عیاں

اختیارِ خود ببیں ، جبری مشو

رہ رہا کردی ، برہ آ ، کج مرو[2]

اختیارے ہست ما را ناپدید

چوں دو مطلب دید آید در مزید

جملہ عالم شد مقر در اختیار

امر و نہیِ ایں بیار و آں میار

او ہمی گوید کہ امر و نہی لاست

اختیارے نیست ویں جملہ خطا ست

۱- زبور ، ص ۲۲۸ -

۲- مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۹ ، س ۲۸ -

جملہ قرآں امر و نہی است و وعید
امر کردن سنگ مرمر را کہ دید
خالقے کو اختر و گردوں کند
امر و نہی جاہلانہ چوں کند[3]

در تردد ماندہ ایم اندر دوکار
ایں تردد کے بود بے اختیار
ایں کنم یا آں کنم خود کے شود
چوں دو دست و پائے او بستہ بود
ہیچ باشد ایں تردد بر سرم
کہ روم در بحر یا بالا پرم
ایں تردد ہست کہ موصل روم
یا برائے سحر تا بابل روم
پس تردد را بباید قدرتے
ورنہ آں خندہ بود بر سبلتے[4]

در ہر آں کارے کہ میل استت بداں
قدرتِ خود را ہمی بینی عیاں

۳- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۰ ، س ۲۶ ، ۲۸ -
۴- مثنوی : ۶ ، ص ۳۵۸ ، س ۲۱ تا ۲۳ -

در هرآں کارے کہ میلت نیست و خواست

اندر آں جبری شوی کیں از خداست[۵]

لفظِ جبرم عشق را بے صبر کرد

وانکہ عاشق نیست حبسِ جبر کرد

ور بود ایں جبر ، جبرِ عامہ نیست

جبرِ آں امّارۂ خودکامہ نیست

جبر را ایشاں شناسند اے پسر

کہ خدا بکشاد شاں در دل بصر[۶]

ترک کن ایں جبر را کایں بس تہیست

تا بدانی سرِّ سرِّ جبر چیست

ترک کن ایں جبر جمع مسبطلاں

تا جزا یابی ازاں جبرِ چو جاں[۷]

۵- مثنوی : ۱ ، ص ۱۵ ، س ۱۸ -

۶- مثنوی : ۱ ، ص ۳۱ ، س ۲۴ ، ۲۵ -

۷- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۳ ، س ۵ ، ۶ -

توضیحات :

جبر و اختیار کے بارے میں روسی کے تمام مندرجہ بالا اشعار (۲ تا ۷) ہمیں جس نکتے تک پہنچاتے ہیں ان کو حدیثِ نبوی کے حوالے سے اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

چنیں فرمودۂ سلطانِ بدر است
کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است(۲)

☆ ☆ ☆

۷

اختیار ۔ ارادہ و عمل

اقبال

اے کہ گوئی محملِ جان است تن
سرِ جاں را در نگر بر تن متن
محملے نے ، حالے از احوالِ اوست
محملش خواندن فریبِ گفتگو ست
چیست جاں ؟ جذب و سرور و سوز و درد
ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد
چیست تن ؟ با رنگ و بو خو کردن است
با مقامِ چار سو خو کردن است
از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
وا رہاند جذب و شوق از تحت و فوق

این بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست[1]

روحی

جان کشاید سوے بالا بالها
در زده تن در زمین چنگالها[2]

شاهِ جان مر جسم را ویران کند
بعدِ ویرانیش آبادان کند
کرد ویرانِ خانه بهرِ گنج زر
وز همان گنجش کند معمور تر[3]

روح بے قالب نتاند کار کرد
قالبِ بے جان بود بیکار و سرد
قالبِ بیجان کم از خاک است دوست
روح چون مغز است ، قالب همچو پوست
قالبِ پیدا و آن جان بس نهان
راست شد زین هر دو اسبابِ جهان

۱- جاوید : ص ۲۰ -
۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۴۰ ، س ۲۹ -
۳- مثنوی : ۱ ، ص ۸ ، س ۲۷ ، ۲۸ -

خاک را بر سر زنی سر نشکند

آب را بر بر زنی ، بر نشکند

گر تو میخواهی کہ سر را بشکنی

خاک را و آب را برهم زنی[۴]

بحر علمے در نمے پنہاں شدہ

در دو گز تن عالمے پنہاں شدہ[۵]

جسم از جاں روز افزوں میشود

چوں رود جاں ، جسم بیں چوں میشود

حد جسمت یک دو گز خود بیش نیست

جانِ تو تا آسماں جولاں کنیست[۶]

ایں جہانِ منتظم محشر شود

گر دو دیدہ مبدل و انور شود[۷]

توضیحات :

رومی نے کہا ہے ”جاں کشاید سوے بالا بالہا“(۲) ۔ اقبال

۴- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۶ ، س ۳۸ تا ۴۰ -

۵- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۹ ، س ۱۷ -

۶- مثنوی : ۴ ، ص ۲۴۹ ، س ۱ ، ۲ -

۷- مثنوی : ۶ ، ص ۳۶۵ ، س ۹ -

نے روح کے بارے میں یہاں جو کچھ کہا ہے اسی نکتے کی توضیح ہے ، مثلاً اقبال کا شعر ہے :

چیست جان جذب و سرور و سوز و درد
ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گیرد گرد (۱)

جسم کے بارے میں رومی نے کہا ہے ''در زدہ تن در زمین چنگالہا'' (۱) ۔ اقبال نے عالمِ آب و گل سے جسم کے اس مادی رشتے کو یوں واضح کیا ہے :

چیست تن ؟ با رنگ وبو خو کردن است
با جہانِ چار سو خو کردن است (۱)

☆ ☆ ☆

۸

ارتقاء ۔ ارتقائے حیات و کائنات

اقبال

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
هزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است[۱]

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون[۲]

کجاست منزلِ ایں خاکدانِ تیرہ نہاد
کہ هرچہ هست چو ریگِ رواں بہ پرواز است[۳]

۱- پیام ، ص ۱۰۸ -
۲- بال ، ص ۴۴ -
۳- پیام ، ص ۲۱۳ -

زندگیِ رهرواں در تگ و تاز است و بس
قافلۂ موج را جادہ و منزل کجا ست[۴]

رومی

کُلَّ یومٍ ھوَ فی شانٍ بخواں
مر ورا بے کار و بے فعلے مداں[۵]

حق ز ایجادِ جہاں افزوں نشد
آنچہ اوّل آں نبود ، اکنوں نشد
لیک افزوں شد اثر ز ایجادِ خلق
درمیانِ آں فراواں است فرق[۶]

توضیحات :

رومی نے ایجادِ جہاں اور ایجادِ خلق میں ارتقاء کا جو تصوّر دیا ہے اور مذکورہ آیۂ مبارکہ (۵) سے اس حقیقت کی ترجمانی کے لیے جو استفادہ کیا ہے ، اقبال نے اس کی بنیاد پر اپنے اشعار میں بیان کے نئے نئے پیرایے اختیار کیے ہیں ، جن کی صرف چار مثالیں یہاں درج کی گئی ہیں ۔

☆ ☆ ☆

۴- پیام ، ص ۲۰۴ ۔
۵- مثنوی : ۱ ، ص ۶۱ ، س ۲۹ ۔
۶- مثنوی : ۴ ، ص ۲۴۲ ، س ۲۷ ۔

۹

افلاطون ۔ فلسفۂ افلاطون

اقبال

راہبِ اول فلاطونِ حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم[1]

رومی

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما[2]

عقلِ جزوی آفتش وہم است و ظن
زانکہ در ظلمات شد او را وطن[3]

۱- اسرار ، ص ۳۴ -
۲- مثنوی : ۱ ص ۲ ، س ۱۶ -
۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۶۲ ، س ۵ -

توضیحات :

رومی نے ''افلاطون و جالینوس'' (۲) کو چھوڑ کر عشق کو رہبرِ کامل بنانے کا پیغام دیا ہے اور ''وھم و ظن'' (۳) سے پناہ میں رہنے کی تلقین کی ہے - رومی کی نظر میں اہلِ ''وھم و ظن'' (۳) کا مقام ظلمتوں کی خلوت میں ہے - اقبال نے وہم و ظن کے خلوت نشیں افلاطون کو اس کے تخیّلات کی وجہ سے ، جو زندگی کی واقعیتوں سے دور اور حقیقت کے نور سے محروم ہیں ، راھبِ اوّل کہا ہے -

۱۰

افلاطون ۔ شاعری اور نوافلاطونی تخیّل

اقبال

وائے قومے کز اجل گیرد برات
شاعرش وابوسد از ذوقِ حیات
خوش نماید زشت را آئینہ اش
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش[1]

رومی

آب حیوان خوان مخوان ایں را سخن
روحِ نو بیں در تنِ حرفِ کہن[2]

حرف ظرف آمد ، درو معنی چو آب
بحر معنی عندہ اُم الکتاب[3]

۱۔ اسرار ، ص ۳۹ ۔
۲۔ مثنوی : ۱ ، ص ۵۲ ، س ۲۹ ۔
۳۔ مثنوی : ۱ ، ص ۸ ، س ۲۲ ۔

گر حدیثت کژ بود ، معنیست راست
آں کژیِ لفظ مقبولِ خدا ست
ور بود معنی کژ و لفظت نکو
آنچناں معنی نیرزد یک تسو[۴]

آنچہ با معنی ست خود پیدا شود
وانچہ بے معنی ست خود رسوا شود
رو ، بمعنی کوش ، اے صورت پرست
زانکہ معنی بر تنِ صورت پر است
هم نشینِ اهلِ معنی باش تا
هم عطا یابی و هم باشی فتا
جانِ بے معنی دریں تن بے خلاف
هست ، همچوں تیغِ چوبیں در غلاف[۵]

لفظ را مانندۂ ایں جسم داں
معنیش را در دروں مانندِ جاں
دیدۂ تن دائما تن بیں بود
دیدۂ جاں جانِ هر فن بیں بود[۶]

۴- مثنوی : ۳ ، ص ۱۴۰ ، س ۳۰ ، ۳۱ -
۵- مثنوی : ۱ ، ص ۱۷ ، س ۲ تا ۴ -
۶- مثنوی : ٦ ، ص ۳٦۲ ، س ۱۴ -

معنیِ تو صورت است و عاریت
بر مناسب شادی و بر قافیت
معنی آں باشد کہ بستاند ترا
بے نیاز از نقش گرداند ترا
معنی آں نبود کہ کور و کر کند
مر ترا بر نقش عاشق تر کند۷

توضیحات :

اقبال نے شعر و سخن پر تنقید ''ذوقِ حیات'' (۱) کے حوالے سے کی ہے - رومی نے ''شعر و سخن'' (۲) کو ''آبِ حیواں'' (۲) کہہ کر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ شعر و ادب کی کسوٹی حیاتِ انسانی ہے -

رومی کے دوسرے مندرجہ بالا اشعار میں لفظ و معنی کے رشتے کا ذکر ہے اور لفظ کے مقابل معنی کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے - پھر معنی کو بھی رومی اس کسوٹی پر پرکھتے ہیں :

معنی آں باشد کہ بستاند ترا
بے نیاز از نقش گرداند ترا

وہ ''دیدۂ جاں'' (٦) کو فن کا صحیح مبصّر قرار دیتے ہیں -

☆ ☆ ☆

۷- مثنوی : ۲ ، ص ۹۰ ، س ۲۲ ، ۲۳ -

۱۱

انسان اور جہانِ مادی: عالَم و آدم ۔ عالِم و معلوم

اقبال

برون از خویش می بینی جہان را
درو دشت و یم و صحرا و کان را
دلِ ما را بہ او پوشیدہ راہے است
کہ ہر موجود ممنونِ نگاہے است
کمالِ ذاتِ شے موجود بودن
برائے شاہدے مشہود بودن
جہان غیر از تجلّی ہائے ما نیست
کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست[1]

۱- زبور (گلشنِ رازِ جدید) ، ص ۲۱۲ و ۲۱۳ -

رومی

این عرض ها از چه زاید از صور
وین صور هم از چه زاید از فکر
این جهان یک فکرِ تست از عقلِ کل
عقل چون شاه است و فکرت‌ها رسل[۲]

خلق بے پایان ز یک اندیشه بیں
گشته چوں سیلے روانه بر زمیں
هست آں اندیشه پیشِ خلق خورد
لیک چوں سیلے جہاں را خورد و برد
پس چو می بینی که از اندیشهٔ
قایم است اندر جہاں هر پیشهٔ
خانه ها و قصرها و شهرها
کوه ها و دشت ها و نهر ها
هم زمین و بحر و هم مہر و فلک
زنده از وے همچو از دریا سمک[۳]

پس چرا از ابلہی پیش تو کور
تن سلیمانست و اندیشه چو مور

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۹۳ ، س ۹ -
۳- مثنوی : ۲ ، ص ۹۵ ، س ۱۰ - ۱۲ -

حس اسیرِ عقل باشد ، اے فلاں !
عقل اسیرِ روح باشد ، ہم بداں
دست بستہ عقل را جاں باز کرد
کارہاے بستہ را ہم ساز کرد[۴]

در ہواے غیب مرغے می پرد
سایۂ او بر زمیں می گسترد
جسم سایہ سایۂ سایۂ دل است
جسم کے اندرخورِ پایۂ دل است[۵]

باغ‌ہا و سبزہ‌ہا در عینِ جاں
بربروں عکسش چو در آبِ رواں
آں خیالِ باغ باشد اندر آب
کہ کند از لطفِ آب آں اضطراب
باغ‌ہا و میوہ‌ہا اندر دل است
عکسِ لطفِ آں بریں آب و گل است
گر نبودے عکسِ آں سِرّ و سرور
پس نخواندے ایزدش دارالغرور

۴- مثنوی : ۳ ، ص ۱٦٦ ، س ۲۷ -
۵- مثنوی : ٦ ، ص ۳۰۱ ، س ۲۱ -

این غرور آنست یعنی این خیال
هست از عکس دل و جان رجال[6]

نیست دید رنگ بے نور دروں
هم چنیں نور خدائے اندروں
این بروں از آفتاب و از سہا
واں دروں از عکسِ انوارِ علا
نورِ نورِ چشم خود نور دل است
نورِ چشم از نور دلہا حاصل است
باز نورِ نورِ دل ، نور خداست
کو ز زنگ عقل وحس پاک و جداست[7]

جوهر است انسان و چرخ اورا عرض
جمله فرع و سایه اند و تو غرض[8]

توضیحات :

(۱) اقبال نے عالمِ خارج کو ''در و دشت و یم و صحرا و کاں'' سے تعبیر کیا ہے - یہ رومی کے پیرایۂ بیان کا تتبّع ہے۔ رومی کے

۶- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۷ ، س ۳۳ - ۳۵ -
۷- مثنوی : ۱ ، ص ۲۵ ، س ۲۰ -
۸- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۹ ، س ۱۵ -

الفاظ ہیں :

خانہ ہا و قصر ہا و شہر ہا
کوہ ہا و دشت ہا و نہر ہا

نیز : ''ہم زمین و بحر و ہم مہر و فلک'' (۳) ۔ ''باغ ہا و میوہ ہا'' (٦) ۔ ''آب و گل ۔'' (٦)

اقبال کے اشعار میں ''دل'' اور ''نور'' الفاظ (۱) رومی کے اس شعر کا پرتو ہیں :

نور نور چشم خود نورِ دل است
نور چشم از نور دلہا حاصل است

پھر رومی کے اشعار میں 'نور دل' سے 'نورِ خدا' تک رسائی کے بیان کو فلسفۂ مغرب میں Kant اور Fichte کی مماثل فکر پر زمانی تقدم حاصل ہے ، اور خود رومی نے یہ نکتہ اپنے دوسرے معارف کی طرح قرآنِ حکیم سے اور ارشاداتِ نبوی سے لیا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۱۲

انسان اور کائنات ۔ انسان اور عالمِ مادی

اقبال

آنچہ در آدم بگنجد عالم است
آنچہ در عالم نگنجد آدم است[1]

در شکن آن را کہ ناید سازگار
از ضمیرِ خود دگر عالم بیار
بندۂ آزاد را آید گران
زیستن اندر جہانِ دیگران[2]

رومی

انبیا را تنگ آمد این جہان
چون شہان گشتند اندر لامکان

۱- جاوید ، ص ۷۵ -
۲- جاوید ، ص ۲۲۵ -

مردگاں را ایں جہاں بنمود فر
ظاہرش زفت و بمعنی تنگ تر
گر نبودے تنگ، ایں افغاں ز چیست
چوں دوتا شد ہرکہ روزے بیش زیست[۳]

ہمچو گرمابہ کہ تفسیدہ بود
تنگ آئی جانت بخسیدہ بود
گرچہ گرمابہ عریض است و طویل
زاں تپش تنگ آیدت جاں کایل
تا بروں نائی نہ بکشاید دلت
پس چہ سود اندر فراخی منزلت
یا کہ کفش تنگ پوشی، اے غوی
در بیابانِ فراخے میروی
آں فراخیِ بیاباں تنگ گشت
بر تو زنداں آمد آں صحرا و دشت
ہر کہ دید او مرترا از دور گفت
کہ دراں صحرا چو لالہ بر شگفت
او نداند کہ تو ہمچوں ظالماں
از بروں در گلشنی، جاں در فغاں[۴]

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۴ ، س ۸ ، ۹ -
۴- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۴ ، س ۱۲ تا ۱۵ -

خلق را از بند صندوق فسون
کہ خرد جز انبیاء و مرسلون
از هزاران کس یکے خوش منظر است
کو بداند کہ بہ صندوق اندر است
آنکہ داند تو نشانش آن شناس
کو ز روح این جہان دارد هراس
آن جہان را دیدہ باشد پیش ازان
تابدان ضد این ضدش گردد عیان[۵]

تو کہ زاصطرلاب دیدہ بنگری
در جہان دیدن یقین بس قاصری
تو جہان را قدر دیدہ دیدهٔ
کو جہان سبلت چرا مالیدهٔ
عارفان را سرمہ‌ٔ هست آن بجوی
تاکہ دریا گردد این چشم چو جوی[۶]

اے تو در پیکار خود را باختہ
دیگران را تو ز خود نشناختہ

۵- مثنوی : ۶ ، ص ۴۱۸ ، س ۳۸ ، ۳۹ -
۶- مثنوی : ۵ ، ص ۳۱۱ ، س ۶ ، ۷ -

تو بہر صورت کہ آئی نیستی
کہ منم این ، واللہ آن تو نیستی

یک زمان تنہا بمانی تو ز خلق
وز غم و اندیشہ مانی تا بحلق

این تو کے باشی کہ تو آن اوحدی
کہ خوش و زیبا و سرمست خودی

مرغ خویشی ، صید خویشی ، دام خویش
صدر خویشی ، فرش خویشی ، بام خویش

جوهر آن باشد کہ قایم با خود است
آن عرض باشد کہ فرع او شد است

گر تو آدم زادۂ ، چون او نشین
جملۂ ذرات را در خود بہ بین

چیست اندر خم کہ اندر نہر نیست
چیست اندر خانہ کاندر شہر نیست

این جہان خم است و دل چون جوے آب
این جہان حجرہ است و دل شہر عجاب[7]

نیست شاہ شہر ما بیہودہ گیر
ہست تمییزش ، سمیعست و بصیر

۷- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۹ ، س ۷ تا ۱۱ -

آدمی باش و ز خرگیران مترس
خر نه‌ٔ اے عیسیِ دوران مترس
چرخ چارم هم ز نور تو پُرست
حاش لله که مقامت آخرست
تو ز چرخ و اختران هم برتری
گرچه بهر مصلحت در آخری
میرِ آخر دیگر و خر دیگرست
نه هر آنکه اندر آخر شد خرست[8]

عشق بحرے آسمان برو‌ے کفے
چون زلیخا در هوائے یوسفے
دور گردون را ز موج عشق دان
گر نبودے عشق بفسردے جهان
کے جمادے محو گشتے در نبات
کی فدائے روح گشتے نامیات
روح کے گشتی فدائے آن دمے
کز نسیمش حامله شد مریمے
هر یکے بر جا فسردے همچو یخ
کی بدے پرّان و جویان چون ملخ

۸- مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۲ ، س ۲۹ تا ۳۱ -

ذرہ ذرہ عاشقان آن کمال
می شتابد در علو همچون نہال
سبّح للہ ہست اشتابشان
تنقیۂ تن می کنند از بہر جان[۹]

ہین بیا زین سو ببین کین ارغنون
می زند یا لیت قومی یعلمون
داد ما را فضل حق فرعونیے
نے چنین فرعونیِ بے عونیے
سر برآر و ملک بین زندہ و جلیل
اے شدہ غرّہ بہ مصر و رودِ نیل
گر تو ترک این نجس خرقہ کنی
نیل را در نیلِ جان غرقہ کنی
ہین بدار از مصر اے فرعون دست
درمیان مصر جان صد مصر ہست
تو أنا رب همی گوئی مدام
غافل از ماہیتِ این ہر دو نام
رب بر مربوب کے لرزان بود
کے أنادان بندِ جسم و جان بود[۱۰]

۹- مثنوی : ۵ ، ص ۳۴۴ ، س ۱۴ تا ۱۷ -
۱۰- مثنوی : ۵ ، ص ۳۴۸ ، س ۲۷ ، ۳۰ -

صد چو عالم در نظر پیدا کند
چونکہ چشمت را بخود بینا کند[11]

پس بصورت آدمی نوع جہاں
در صفت اصل جہاں این را بداں
ظاہرش را پشۂ آرد بہ چرخ
باطنش باشد محیطِ ہفت چرخ[12]

پس بظاہر عالمِ اصغر توئی
پس بباطن عالمِ اکبر توئی[13]

توضیحات :

اقبال کا مصرع ہے :

آنچہ در آدم بگنجد عالم است (۱)

رومی نے انسان کو مخاطب کر کے کہا ہے :

گر تو آدم زادہ ای چوں او نشیں
جملۂ ذرات را در خود بیں (۷)

رومی کے مصرعے : ''صد چو عالم در نظر پیدا کند'' (۱۱) میں اور اس مصرعے : ''باطنش باشد محیط ہفت چرخ'' (۱۲) میں ، نیز اس مصرعے میں : ''پس بباطن عالمِ اکبر توئی''(۱۳) وہ حقیقت بیان ہوئی ہے جسے

۱۱- مثنوی : ۱ ، ص ۱۳ ، س ۱۷ -
۱۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۲ ، س ۱۸ ، ۲۳ -
۱۳- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۴ ، س -

اقبال نے ان الفاظ میں اظہار بخشا : ''آنچہ در عالم نگنجد آدم است'' (۱)۔ ہمارے عرفا کے اقوال اور تصوّف کے ادب میں یہ نکتہ طرح طرح سے بیان ہوتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ حضرت علی علیہ السلام کے اس ارشاد سے شروع ہوتا ہے : ''أتزعم انک جرم صغیر و فیک انطوی العالم الاکبر۔'' (کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا پیکر ہے ؟ تجھ میں تو عالمِ اکبر پوشیدہ ہے !) ۔

۱۳

انسان اور کائنات ۔ اہمیتِ عالمِ مادی ۔ تسخیرِ زمان و مکان

اقبال

اے کہ از تاثیرِ افیون خفتہ ای
عالمِ اسباب را دون گفتہ ای
خیز و وا کن دیدۂ مخمور را
دون مخوان این عالمِ مجبور را[1]

رومی

گر منی گندہ بود ہمچو منی
چون بجان پیوست گردد روشنی
ہر جمادے کو کند رو در نبات
از درخت بخت او روید حیات

۱- رموز ، ص ۹۱ ، ۹۱ -

هر نباتے کو بجاں رو آورد
خضر وار از چشمۂ حیوان خورد
باز چوں جاں رو سوے جاناں نہد
رخت را در عمرِ بے پایاں نہد[۲]

آمده اوّل بہ اقلیمِ جماد
از جمادے در نباتے اوفتاد
سال ها اندر نباتے عمر کرد
وز جمادے یاد ناورد از نبرد
وز نباتے چوں بحیواں اوفتاد
نامدش حال نباتے هیچ یاد
جز همان میلے کہ دارد سوے آں
خاصہ در وقت بہار و ضیمراں
باز از حیواں سوے انسانیش
میکشد آں خالقے کہ دانیش
همچنیں ز اقلیم تا اقلیم رفت
تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقل هاے اوّلینش یاد نیست
هم ازیں عقلش تحوّل کردنیست

۲- مثنوی : ٦ ، ص ۳۵۳ ، س ۳۳۰ تا ۳۵ -

تا رهد زیں عقلِ پُر حرص و طلب
تا هزاراں عقل بیند بوالعجب[۳]

نردبانهائے ست پنہاں در جہاں
پایہ پایہ تا عنانِ آسماں
هر کره را نردبانے دیگر است
هر روش را آسمانے دیگر است[۴]

گندمے را زیر خاک انداختند
پس ز خاکش خوشه‌ها برساختند
بار دیگر کوفتندش ز آسیا
قیمتش افزود و ناں شد جانفزا
باز ناں را زیرِ دنداں کوفتند
گشت عقل و جان و فهم سودمند
باز آں جاں چوں بحق او محو شد
باز ماند از سکر و سوئے صحو شد
عالمے را زاں صلاح آمد ثمر
قوم دیگر را فلاح منتظر[۵]

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۲۷۳ ، س ۱۱ تا ۱۳ ، ۱۶ ، ۱۷ -
۴- مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۲ ، س ۳۴ ، ۳۵ -
۵- مثنوی : ۱ ، ص ۶۳ ، س ۱۶ تا ۱۸ -

کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فی شأنٍ بخوان
مر ورا بےکار و بے فعلے مدان
کمترین کارش بہر روز آن بود
کو سہ لشکر را روانہ میکند
لشکرے زاصلاب سوے اُمّہات
بہر آن تا در رحم روید نبات
لشکرے زارحام سوے خاکدان
تا ز نرّ و ماده پُر گردد جہان
لشکرے از خاکدان سوے اجل
تا ببیند هر کسے حسنِ عمل[۶]

این صور چون صورت بےصورت اند
پس چرا در نفیِ صاحب نعمت اند
این صور دارد ز بےصورت وجود
چیست پس بر موجد خویشش جحود
صورتِ دیوار و سقفِ هر مکان
سایۂ اندیشۂ معمار دان
گرچہ خود اندر محلِّ افتکار
نیست سنگ و چوب و خشتے آشکار

۶- مثنوی : ۱ ، ص ۶۱ ، س ۲۹ تا ۳۱ -

فاعلِ مطلق یقیں بے صورت است
صورت اندر دست او چوں آلت است[7]

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم
گفت پیغمبر[ؐ] کہ حق فرمودہ است
قصد من از خلق احسان بودہ است
آفریدم تا ز من سودے کنند
تا ز شہدم دست آلودے کنند[8]

ہر کہ جویاے امیری شد یقیں
پیش ازاں اندر اسیری شد رہیں
عکس میداں نقش دیباچہ جہاں
نام ہر بندۂ جہاں، خواجۂ جہاں[9]

چیست دنیا؟ از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن[10]

۷- مثنوی : ۶، ص ۳۰۷، س ۱۴ تا ۱۷ -
۸- مثنوی : ۲، ص ۱۱۹، س ۲۷ -
۹- مثنوی : ۶، ص ۱۱۷، س ۳۸، ۳۹ -
۱۰- مثنوی : ۱، ص ۲۲، س ۳۰ -

چاه را تو خانهٔ بینی شریف
دام را تو دانهٔ بینی لطیف
این تسفسط نیست تقلیبِ خطاست
می نماید که حقیقتها کجاست
آن که انکار حقایق می کند
جملگی او بر خیالے می تند
او همی گوید که حسبان خیال
هم خیالے باشدت ، چشمے بمال[11]

از دو پاره پیه آن نور روان
موج نورش میرود تا آسمان
گوشت پاره که زبان آمد ازو
میرود سیلاب حکمت همچو جو
سوئے سوراخے که نامش گوشهاست
تا بباغ جاں که میوه اش هوشهاست
شاهراه باغ جانها شرع اوست
باغ و بستانهاے عالم فرع اوست[12]

۱۱- مثنوی : ۶ ، ص ۳۰۶ ، س ۲۵ ، ۲۷ -
۱۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۶ ، س ۳۵ ، ۳۶ -

سنگ بر آهن نہی آتش جہد
هم بامر حق ، قدم بیروں نہد
سنگ و آهن خود سبب آمد ولیک
تو ببالاتر نگر ، اے مردِ نیک
کایں سبب را آں سبب آورد پیش
بے سبب کے شد سبب هرگز بخویش
ایں سبب را آں سبب عامل کند
باز گاهے بے پر و عاطل کند
واں سبب ها کانبیا را رهبر است
آں سببها زیں سببها برتر است
ایں سبب را محرم آمد عقل ما
واں سبب ها راست محرم انبیاء[۱۳]

اے گرفتار سبب بیروں مپر
لیک عزل آں مسبب ظن مبر
هرچہ خواهد آں مسبّب آورد
قدرت مطلق سبب ها بر درد

۱۳- مثنوی : ۱ ، ص ۱۹ ، س ۳۶ تا ۳۸ - و ص ۲۰ ، س ۱ -

لیک اغلب بر سبب رالد لفاذ
تا بدالد طالبے جستن مراد[۱۴]

اے دریدہ پوستین یوسفاں
گرگ برخیزی ازایں خواب گراں
گشتہ گرگاں یک بیک خوھاے تو
می درانند از غضب اعضاے تو
خوں نخسپد بعد مرگت در قصاص
تو مگو کہ مردم و یابم خلاص
ایں قصاص نقد حیلت سازیست
پیش زخم آں قصاص ایں بازیست
زیں لعب خواندست دنیا را خدا
کیں جزا لعبیست پیشِ آں جزا[۱۵]

اقبال

زمانے با ارسطو آشنا باش
دمے با سازِ بیکن ہم نوا باش
ولیکن از مقامِ شاں گذر کن
مشو گم اندریں منزل ، سفر کن

۱۴- مثنوی : ۵ ، ص ۳۰۵ ، س ۱۴ ، ۱۵ -
۱۵- مثنوی : ۴ ، ص ۲۷۴ ، س ۲۴ تا ۲۶ -

به آن عقلے کہ داند بیش و کم را
شناسد اندرونِ کان و یم را[۱۶]

رومی

حسِ دنیا نردبانِ این جہان
حسِ عقبیٰ نردبانِ آسمان
صحتِ این حس بجوئید از طبیب
صحتِ آن حس بجوئید از حبیب
صحتِ این حس ز معموریِ تن
صحتِ آن حس ز تخریبِ بدن[۱۷]

اقبال

جہانِ چند و چون زیرِ نگین کن
بگردون ماہ و پروین را کمین کن
و لیکن حکمتِ دیگر بیاموز
رہان خود را ازین مکرِ شب و روز[۱۸]

رومی

گر تو خواہی کت شقاوت کم شود
جہد کن تا از تو حکمت کم شود

۱۶- زبور ، ص ۲۱۸ -
۱۷- مثنوی : ۱ ص ۸ ، ص ۲۶ ، ۲۷ -
۱۸- زبور ، ص ۲۸۱ -

حکمتے کز طبع آید وز خیال
حکمتے بے فیضِ نورِ ذوالجلال
حکمتِ دنیا فزاید ظن و شک
حکمت دینی برد فوق فلک[۱۹]

زیں قدح‌هاے صور کم باش مست
تا نگردی بت تراش و بت پرست
از قدح‌هاے صور بگذر ، مایست
باده در جام است لیک از جام نیست[۲۰]

خاتمِ ملکِ سلیمان است علم
جمله عالم صورت و جان است علم
آدمی را زین هنر بیچاره گشت
خلق دریا ها و خلق کوه و دشت
زو پلنگ و شیر ترسان همچو موش
زو شده پنهان بدشت و کُه وحوش
زو پری و دیو ساحل ها گرفت
هر یکے در جاے پنهان جا گرفت

۱۹- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۸ ، س ۷ ، ۸ -
۲۰- مثنوی : ٦ ، ص ۳۰٦ ، س ۳٦ -

آدمی را دشمن پنہاں بسے است
آدمیِ با حذر ، عاقل کسے است[21]

حسِ ابداں ، قوتِ ظلمت میخرد
حسِ جاں از آفتابے میچرد[22]

تاجِ کرمناست بر فرقِ سرت
طوقِ اعطیناک آویزِ برت
جوہر است انسان و چرخ او را عرض
جملہ فرع و سایہ اند و تو غرض
علم جوئی از کتب ہائے فسوس
ذوق جوئی تو ز حلوائے سبوس
اے غلامت عقل و تدبیرات و ہوش
تو چرائی خویش را ارزاں فروش
خدمتت بر جملہ ہستی مفترض
جوہرے چوں عجز دارد با عرض
بحر علمے در نمے پنہاں شدہ
در سہ گز تن عالمے پنہاں شدہ[23]

۲۱- مثنوی : ۱ ، ص ۲۳ ، س ۲٦ تا ۲۸ -
۲۲- مثنوی : ۲ ، ص ۷۹ ، س ۲٦ -
۲۳- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۹ ، س ۱۳ تا ۱۷ -

آنکہ واقف گشتہ بر اسرارِ ہُو
سرِّ مخلوقات چہ بود پیشِ او
آنکہ بر افلاک رفتارش بود
بر زمین رفتن چہ دشوارش بود[۲۴]

آن طبیبانِ طبیعت دیگرند
کہ بدل از راہ نبضے بنگرند
ما بدل بے واسطہ خوش بنگریم
کز فراست ما بہ اعلیٰ منظریم[۲۵]

تو چہ داری و چہ حاصل کردہ ای
از تکِ دریا چہ دُر آوردہ ای[۲۶]

روزِ مرگ این حسِّ تو باطل شود
نورِ جان داری کہ یارِ دل شود[۲۷]

۲۴- مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۱ ، س ۳۷ ، ۳۸ -
۲۵- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۰ ، س ۱ ، ۲ -
۲۶- مثنوی : ۲ ، ص ۹۳ ، س ۳۰ -
۲۷- مثنوی : ۲ ، ص ۹۳ ، س ۳۱ -

تن ز جان و جان ز تن مستور نیست
لیک کس را دیدِ جان دستور نیست[۲۸]

زانکه با جامه در آنسو راه نیست
تن ز جان و جان ز تن آگاه نیست[۲۹]

جان کشاید سوے بالا بالها
در زده تن در زمین چنگالها[۳۰]

علّتِ تنگیست ترکیب و عدد
جانبِ ترکیب حس ها میکشد
زان سوے حس عالمِ توحید دان
گر یکے خواهی بدان جانب بران[۳۱]

خاک زن بر دیدهٔ حس بینِ خویش
دیدهٔ حس دشمنِ عقل است و کیش

۲۸- مثنوی : ۱ ، ص ۲ ، س ۳ -
۲۹- مثنوی : ۱ ، ص ۵٦ ، س ۱۰ -
۳۰- مثنوی : ۳ ، ص ۲۳۰ ، س ۲۹ -
۳۱- مثنوی : ۱ ، ص ٦۲ ، س ۱۱ -

دیدۂ حس را خدا اعماش خواند
بت پرستش گفت و ضدِ ماش خواند
زانکہ او کف دید و دریا را ندید
زانکہ حالے دید و فردا را ندید[۳۲]

گر نبودے حسِ دیگر مر ترا
جز حسِ حیوان ز بیرون هوا
پس بنی آدم مکرّم کے بُدے
کے بحسِ مشترک محرم شدے[۳۳]

چون درِ معنی زنی ، بازت کنند
پرِ فکرت زن کہ شهبازت کنند
پرِ فکرت شد گل آلودہ گران
زانکہ گل خواری ، ترا گل شد چو نان[۳۴]

فکر آن باشد کہ بکشاید رہے
راہ آن باشد کہ پیش آید شہے[۳۵]

۳۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۳ ، س ۳۴ ، ۳۵ -
۳۳- مثنوی ۲ ، ص ۸۰ ، س ۷ -
۳۴- مثنوی : ۱ ، ص ۵۸ ، س ۱۱ -
۳۵- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۸ ، س ۱۰ -

هر کہ در خلوت بہ بینش یافت راہ
او ز دانش ہا نجوید دستگاہ
با جمال جان چو شد ہم کاسہ
باشدش زاخبار و دانش تاسہ[٣٦]

ور بخوانی صد صحف بے سکتہ
بے قدر یادت نماند لکتہ
ور کنی خدمت ، نخوانی یک کتیب
علم ہائے نادرہ یابی ز جیب[٣٧]

اقبال

نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس
بیا کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد[٣٨]

بہ خردِ راہِ عشق می پوئی
بہ چراغ آفتاب می جوئی[٣٩]

٣٦- مثنوی : ٣ ، ص ١٩٩ ، س ٩ -
٣٧- مثنوی : ٦ ، ص ٣٨١ ، س ١٥ ، ١٦ -
٣٨- پیام ، ص ١٩٣ -
٣٩- مثنوی : ٣ ، ص ٢٦٩ ، س ٨ ، ٩ -

پا بزندانِ مظاہر بستہ ای
از حدودِ حس بروں ناجستہ ای

رومی

پیش بینیِ خرد تا گور بود
وانِ صاحبدل بنفخ صور بود
ایں خرد از خاک گورے نگذرد
ویں قدم عرصۂ عجائب نسپرد
زیں قدم ویں عقل رو ، بیزار شو
چشم غیبی جوے و برخوردار شو[۴۰]

تا لبِ بحر ایں نشانِ پایہاست
پس نشان پا درونِ بحرِ لاست[۴۱]

تا بدریا سیر اسپ و زیں بود
بعد ازانت مرکب چوبیں بود[۴۲]

توضیحات :

عالمِ اسباب کی اہمیت اور مصلحتوں کو رومی نے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ اقبال کے اسلوب میں وہی حقیقت بصورتِ اجمال

۴۰- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۲ ، س ۸ ۔
۴۱- مثنوی : ٦ ، ص ۴۲۰ ، س ۳۵ ۔

بیان ہوئی ہے - پھر (١٦) کے تحت اقبال کے اشعار اور (٢٠) کے تحت رومی کے اشعار میں بنیادی تطابق خاص طور پر قابل غور ہے - اقبال کے الفاظ ہیں : ''گذر کن'' ، ''سفر کن'' - رومی نے کہا ہے : ''بگذر ، مایست -''

☆ ☆ ☆

۱۴

انسان اور جہانِ عمل

اقبال

خویشتن را چون خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد
در جہان تخمِ خصومت کاشت است
خویشتن را غیرِ خود پنداشت است
سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذتِ پیکار را
بہرِ یک گل خونِ صد گلشن کند
از پیِ یک نغمہ صد شیون کند
عذرِ ایں اسراف و ایں سنگیں دلی
خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی[1]

۱- اسرار، ص ۹، ۱۰ -

رومی

گندمے را زیر خاک انداختند
پس ز خاکش خوشه ها برساختند
بارِ دیگر کوفتندش زآسیا
قیمتش افزود و نان شد جانفزا
باز نان را زیرِ دندان کوفتند
گشت عقل و جان و فہمِ سودمند
باز آن جاں چون بحق او محو شد
باز ماند از سکر و سوے صحو شد
عالمے را زان صلاح آمد ثمر
قوم دیگر را فلاح منتظر[۲]

بر عدم ها کان ندارد چشم و گوش
چون فسون خواند ، همی آید بجوش
از فسونِ او عدمہا زود زود
خوش معلق می زند سوے وجود[۳]

این چنین معدوم کو از خویش رفت
بہترینِ هست ها افتاد زفت

۲- مثنوی : ۱ ، ص ٦۳ ، س ١٦ تا ١٨ -
۳- مثنوی : ۱ ، ص ۳۱ ، س ١٥ -

او به نسبت با حیات حق فناست
در حقیقت در فنا او را بقاست[۴]

...

گرچه آن وصلت بقا اندر بقاست
لیک از اوّل بقا اندر فناست
سایه هائے که بود جویاے نور
نیست گردد چون کند نورش ظهور[۵]

لقمه بخشی آید از هرکس به کس
حلق بخشی کار یزدان است و بس
حلق بخشد جسم را و روح را
حلق بخشد بهر هر عضوے جدا
حلق بببخشد خاک را لطفِ خدا
تا خورد آب و بروید صد گیا
باز حیوان را ببخشد حلق و لب
تا گیاهش را خورد اندر طلب
چون گیاهش خوردوحیوان گشت زفت
گشت حیوان لقمهٔ انسان و رفت

۴- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۲ ، س ۱۷ -
۵- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۲ ، س ۲۵ ، ۲۶ -

باز خاک آمد ، شد اکّالِ بشر
چون جدا شد از بشر روح و بصر[6]

توضیحات :

ملاحظہ ہوں توضیحات زیرِ عنوان ''انسان و جہاں'' نیز ''اہمیتِ عالمِ آب و گل ۔''

☆ ☆ ☆

٦- مثنوی ; ٣ ، ص ١٣٨ ، س ٩ ، ١١ تا ١٣ ۔

۱۵

انسان اور کائنات ۔ حقیقتِ کائنات

اقبال

کہن دیرے کہ بینی مشتِ خاک است
دمے از سرگذشتِ ذاتِ پـاک است[1]

رومی

خلق را چوں آب داں صاف و زلال
وندرو تاباں صفاتِ ذوالجلال[2]

بہر دیدہ روشناں یزدانِ فرد
شش جہت را مظہرِ آیات کرد
تا بہر حیوان و نامی کافرند
از ریاضِ حسنِ ربّانی چرند

۱- زبور ، ص ۲۱۷ -
۲- مثنوی : ۶ ، ص ۳۹۹ ، س ۶ -

بہر آن فرمود با آن اسپ او
حیث ولیتم فثمّ وجہہ[۳]

اصل بیند دیدہ چون اکمل بود
دو ہمی بیند چو مرد اجول بود[۴]

معنیِ اللہ گفت آن سیبویہ
یولہون فی الحوائج ہم لدیہ
گفت الہا فی حوائجنا الیک
والتمسناہا وجدنا ہا لدیک[۵]

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد کانّا الیہ راجعون[۶]

نقش ظاہر بہر نقش غایب است
وان برائے غایب دیگر بہ است[۷]

۳- مثنوی : ٦ ، ص ۳۰۵ ، س ۳۹ ، ۳۰ -
۴- مثنوی : ۵ ، ص ۳۰۸ ، س ۴ -
۵- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۴ ، س ۳۷ - ص ۲۳۵ ، س ۱ -
٦- مثنوی : ۱ ، ص ۲۵ ، س ۲۸ -
۷- مثنوی : ۴ ، ص ۲٦۲ ، س ۱۳ -

توضیحات :

رومی نے ''صفاتِ ذوالجلال'' (۲) کی تجلّیات کو کائنات کی اصل حقیقت بتایا ہے۔ اقبال نے اسی مفہوم کو ان لطیف حکیمانہ الفاظ میں ادا کیا ہے :

''دمے از سرگذشت ذات پاک است'' (۱)

☆ ☆ ☆

۱٦

انسان اور کائنات ۔ عالمِ اسباب

اقبال

ابد را عقلِ ما ناسازگار ست
'یکے' از گیر و دارِ او 'ہزار' ست
'یکے' را آں چناں صد پارہ دیدیم
عدد بہر شمارش آفریدیم
چو لنگ است او سکوں را دوست دارد
نہ بیند مغز و دل بر پوست دارد
حقیقت را چو ما صد پارہ کردیم
تمیزِ ثابت و سیّارہ کردیم[1]

رومی

خود خرد آنست کو از حق چرید
نے خرد کانرا عطارد آورید

۱- زبور ، ص ۲۱٦ -

پیش بینیِ خرد تا گور بود
وانِ صاحب دل بنفخِ صور بود

این خرد از خاک گورے نگذرد
وین قدم عرصهٔ عجائب نسپرد

زین قدم وین عقل رو بیزار شو
چشمِ غیبی جوی و برخوردار شو

زین نظر وین عقل ناید جز دوار
پس نظر بگذار و بگزین انتظار[۲]

بندِ معقولات آمد فلسفی
شهسوارِ عقلِ عقل آمد صفی

عقلِ عقلت مغز و عقلِ تست پوست
معدهٔ حیوان همیشه پوست جوست

مغز چون از پوست دارد صد ملال
مغزِ نغز آنرا حلال آمد حلال

چونکه قشر عقل صد برهان دهد
عقلِ کل کے گام بے ایقان نهد

عقل دفتر ها کند یکسر سیاه
عقلِ عقل آفاق دارد پر ز ماه

۲- مثنوی ، ۳ ، ص ۲۶۹ ، س ۸ تا ۱۰ -

از سیاهی و سپیدی فـارغ است
نورِ ماهش بر دل و جان بازغ است[3]

عقل دو عقل است ، اوّل مکسبی
که در آمـوزی به حرفِ مـکتبـی
از کتاب و اوستاد و ذکر و فکر
از معانی در علومِ خوب و بکر
عقل تو افزون شود بـر دیگران
لیک تو بـاشی ز حفظِ او گران
عقلِ دیـگر بخششِ یزدان بود
چشمهٔ او درمیـانِ جـان بود
چون ز سینـه آب دانش جوش کرد
نه شود شور و نه دیرینه نه زرد[4]

گر هزارانـند ، یک تن بیش نیست
جـز خیـالاتِ عدد اندیش نیست[5]

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۷ ، س ۲۶ -
۴- مثنوی : ۴ ، ص ۲۴۷ ، س ۱۵ -
۵- مثنوی : ۲ ، ص ۱۳۸ ، س ۱۸ -

توضیحات :

روسی کے الفاظ ''دوار'' (۲) ''صد برهان'' ''دفترها'' (۳) ''هزاران'' اور ''عدد اندیش'' (۵) میں کثرت اور تعدد کا جو تصوّر ہے اسے اقبال نے اپنے ایک مصرعے : ''یکی از گیر و دار او هزار است'' (۱) میں بڑا مؤثر بیان بخشا ہے ۔

۱۷

انسان اور کائنات ۔ کون و فساد ۔ وجود و عدم

اقبال

عذرِ ایں اسراف و ایں سنگیں دلی
خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی
حسنِ شیریں عذرِ دردِ کوہکن
نافۂ عذرِ صد آہوے ختن
خامۂ او نقشِ صد امروز بست
تا بیارد صبحِ فردائے بدست
شعلہ اش جانِ صد ابراہیمؑ سوخت
تا چراغِ یک محمدؐ برفروخت[1]

رومی

دیدۂ دل کو بگردوں بنگریست
دید کانجا ہر دمے مینا گریست

۱۔ اسرار ، ص ۱۳ ۔

قلبِ اعیانست و اکسیرِ محیط
ائتلافِ خرقهٔ تن بے مخیط

تو از آں روزے کہ در ہست آمدی
آتشے یا باد یا خاکے بدی

گر بر آں حالت ترا بودے بقا
کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا

از مبدّل ہستیِ اوّل نماند
ہستیِ بہتر بجائے آں نشاند

ہمچنیں تا صد ہزاراں ہست ہا
بعد یک دیگر دوم بہ ز ابتدا

از مبدّل بیں وسایط را بماں
کز وسایط دور گردی ز اصلِ آں

واسطہ ہرجا فزوں شد وصل جست
واسطہ کم، ذوقِ وصل افزوں تراست

از سبب دانی شود کم حیرتت
حیرتِ تو رہ دہد در حضرتت

ایں بقاہا از فناہا یافتی
از فنا پس رُو چرا برتافتی

زاں فناہا چہ زیاں بودت کہ تا
بر بقا چفسیدهٔ اے نافتا

چون دوم از اولینت بہتر است

پس فنا جوے و مبدّل را پرست[2]

هین بده ای زاغ این جان ، باز باش

پیشِ تبدیلِ خدا جانباز باش

تازہ می گیر و کہن را می سپار

کہ ہر امسالت فزونست از سہ پار[3]

توضیحات :

اقبال کے انداز بیان میں ''نقش صد امروز بست'' (۱) اور ''جان صد ابراهیم سوخت'' (۱) رومی کے ان الفاظ کا تتبّع ہیں :

''همچنیں تا صد هزاراں هست ها'' (۲)

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۲ ، س ۱ تا ۶ -

۳- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۲ ، س ۱۲ -

۱۸

انسان اور کائنات ۔ وسعتِ کائنات

اقبال

کرانِ او درون است و برون نیست
درونش پست ، بالا ، کم، فزون نیست
درونش خالی از بالا و زیر است
ولے بیرونِ او وسعت پذیر است[1]

رومی

حق ز ایجادِ جہاں افزوں نشد
آنچہ اوّل آں نبود ، اکنوں نشد
لیک افزوں شد اثر زایجادِ خلق
درمیانِ آں فراواں است فرق[2]

۱- زبور ، ص ۲۱٦ -
۲- مثنوی : ۳ ، ص ۲۴۲ ، س ۲۷ -

توضیحات :

رومی نے کہا ہے ''افزوں نشد'' (۲) - اس میں دلالتِ تضمنی ہے اور اندازِ بیان مجازی - اصل مراد کمیت اور جہت وغیرہ کی نفی ہے - اقبال نے بھی کہا ہے ''فزوں نیست'' (۱) لیکن تاکیدِ مزید کے لیے ''پست ، بالا ، کم ، فزوں'' الفاظ بڑھا دیے ہیں -

☆ ☆ ☆

۱۹

انسانِ پختہ کار ـ اطاعتِ مردِ پختہ کار

اقبال

گریز از طرزِ جمہوری ، غلامِ پختہ کارے شو
که از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید[1]

رومی

دی شیخ باچراغ همی‌گشت گردِ شهر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست[2]

جملہ حیوانات وحشی ز آدمی
باشد از حیوان انسی در کمی
خون آنہا خلق را باشد سبیل
زانکہ وحشی اند از عقلِ جلیل

۱- پیام ، ص ۱۵۸ -
۲- دیوان ، بیت شماره ۳۶۳۹ -

خون ایشان خلق را باشد روا
زانکہ انسان را نیند ایشان سزا
عزتِ وحشی بدان ساقط شد است
کامِ انسان را مخالف آمد است
پس چہ عزت باشدت اے نادرہ
چون شدی تو حمرٌ مستنفرہ[۳]

چون بسے ابلیس آدم روی ہست
پس بہ ہر دستے نباید داد دست[۴]

این بدان دیگر کہ جنسیت یقین
از رہ معنی است نہ از آب و طین
ہین مشو صورت پرست و زین مگو
سرّ جنسیت بہ صورت در مجو[۵]

جنس و ناجنس از خرد تانی شناخت
سوے صورتہا نشاید زود تاخت

۳- مثنوی : ۱ ، ص ٦۵ ، س ۳۵ تا ۳۷ -
۴- مثنوی : ۱ ، ص ۹ ، س ۵ -
۵- مثنوی : ٦ ، ص ۳۹۵ ، س ۳۵ -

نیست جنسیّت بصورت لی و لک
عیسیٰ[۴] آمد در بشر جنسِ ملک[٦]

اندر آ در سایهٔ آن عاقلے
کس نتاند برد از ره ناقلے
بس تقرب جو بدو سوی الٰہ
سر مپیچ از طاعتِ او هیچ گاه
زانکہ او هر خار را گلشن کند
دیدهٔ هر کور را روشن کند
ظلِّ او اندر زمیں چوں کوه قاف
روح او سیمرغ بس عالی طواف
دست گیرد بندهٔ خاص الٰہ
طالبان را میبرد تا پیش گاه[۷]

خلق دیوانند و شهوت سلسلہ
میکشد شاں سوے دکّان و غلہ
هست ایں زنجیر از خوف و ولہ
تو مبیں ایں خلق را بے سلسلہ

٦- مثنوی ، ٦ ، ص ۳۹٦ ، س ٦ ، ۷ -
۷- مثنوی : ۱ ، ص ۵۹ ، س ۳۷ تا ۳۹ -

میکشاند شان بسوے کشت و کار
میکشد شان سوے کانہا و بحار
میکشاند شان بسوے نیک و بد
گفت حق ”فی جیدھا حبل مسد“[8]

آن خداوندے کہ دادندت عوام
باز بستانند از تو ھمچو وام[9]

ابلیس

کہنہ شد افرنگ را آئین و دیں
سوے آں دیر کہن دیگر مبیں
کردہ ای کارِ خداونداں تمام
بگذر از ’لا‘ ، جانبِ ’الا‘ خرام[10]

ہر دو را جاں ناصبور و نا شکیب
ہر دو یزداں نا شناس ، آدم فریب
زندگی ایں را خروج ، آں را خراج
درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج

۸- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۴ ، س ۵ تا ۷۰ -
۹- مثنوی : ۴ ، ص ۲۶۰ ، س ۱۳ -
۱۰- جاوید ، ص ۸۸ -

این بہ علم و دین و فن آرد شکست
آن برد جان را ز تن ، نان را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل[11]

رومی

از نبی بشنو کہ شیطان در وعید
می‌کند تہدیدت از فقرِ شدید
تا خوری زشت و بری زشت از شتاب
نے مروّت ، نے تأنّی ، نے ثواب[12]

مکرِ شیطان است تعجیل و شتاب
لطفِ رحمان است صبر و احتساب[13]

توضیحات:

اقبال نے ''دو صد خر'' کہا ہے - رومی نے کہا تھا ''دام و دد'' (۲) اور ''حیوان انسی'' (۳) کہ حیوانیت میں ''حیوان وحشی'' (۳) ان سے فرو تر ہیں ، بلکہ رومی نے قرآن کے الفاظ ''حمر مستنفرہ'' (۳) کا حوالہ دیا ہے جس کے معنی ہیں ''خرہای گریزان -''

☆ ☆ ☆

۱۱- جاوید ، ص ۷۰ -
۱۲- مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۰ ، س ۳ ، ۴ -
۱۳- مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۳ ، س ۶ -

۲۰

انسانِ کامل ـ جستجوے انسانِ کامل

اقبال

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا[1]

رومی

دی شیخ با چراغ همی گشت گردِ شهر

کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں همرهانِ سست عناصر دلم گرفت

شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

۱- اسرار، ص ۵۱ -

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست[۲]

توضیحات :

ملاحظہ ہو توضیح زیر عنوان شمارہ ۱۹ ، ۲۱ -

☆ ☆ ☆

۲- دیوان ، بیت شمارہ ۳۶۴۰ -
(دیوان کے متن کے مطابق پہلے مصرعے میں ''گفتم کہ'' کے بجائے ''گفتند'' ہے -

۲۱

انسانِ کامل ـ مقصودِ حیات و کائنات

اقبال

طبعِ فطرت عمر ها در خون تپد
تا دو بیتِ ذاتِ او موزون شود
مشتِ خاکِ ما سرِ گردون رسید
زین غبار آن شهسوار آید پدید
از وجودِ تو سرافرازیم ما
پس به سوزِ این جهان سازیم ما
نوعِ انسان مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی[1]

رومی

دی شیخ با چراغ همی گشت گردِ شهر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

۱- اسرار ، ص ۵۱ -

زیں همرهانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود ، جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست[۲]

توضیحات :

یہاں کسی توضیح کی ضرورت نہیں ہے ۔ خود علامہ نے انسانِ کامل کے بارے میں اپنے تصور کی نمایندگی کے لیے رومی کے ان اشعار کو اپنی فلسفیانہ مثنوی ''اسرار خودی'' کے شروع میں سرِ آغاز کے طور پر درج کیا ہے اور ''جاوید نامے'' میں دہرایا ہے ۔ ''جاوید نامے'' کے صفحہ ۱۲ پر یہ اشعار متعلقہ غزل کے مطلعے اور مزید پانچ اشعار کے ساتھ آئے ہیں ۔ اس مقام پر اس تمثیلی منظومے کی ڈرامائی تنظم میں اپنی یہ غزل رومی نے خود پڑھی ہے ۔

☆ ☆ ☆

۲۔ دیوان ، ابیات شمارہ ہائے ۴۶۳۹ ، ۴۶۳۷ ، ۴۶۴۰ بالترتیب ۔ ملاحظہ ہو آخری بیت سے متعلق ہمارا حاشیہ ص ۸۶ پر ۔

۲۲

جہادِ زندگی ۔ موانع و مشکلات ۔ تخریبی عوامل

اقبال

راست میگویم عدو هم یارِ تست
هستیِ او رونقِ بازارِ تست
کشتِ انسان را عدو باشد سحاب
ممکناتش را برانگیزد ز خواب
سنگِ ره گردد فسانِ تیغِ عزم
قطعِ منزل امتحانِ تیغِ عزم[1]

رومی

در حقیقت هر عدو داروے تست
کیمیاے نافع و دلجوے تست[2]

۱- اسرار ، ص ۵۹ -

۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۱ ، س ۲۳ -

توضیحات :

موانع و مشکلات اور تخریبی عوامل کے لیے اقبال کے اشعار میں بھی وہی لفظ آیا ہے جو رومی نے استعمال کیا ہے یعنی ''عدو''۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے رومی نے یہ لفظ قرآن حکیم سے لیا ہے۔ اقبال نے انسان کو مخاطب کر کے ''عدو'' کے بارے میں کہا ہے ''یارِ تست''۔ رومی نے ''دلجوے تست'' کہا تھا۔

۲۳

جہادِ زندگی ۔ تسخیرِ کائنات

اقبال

ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس
سینہ او عرضہ تیر است و بس[1]

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرہ‌ای تعمیر کرد

اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتہ ای
عالمِ اسباب را دوں گفتہ ای
خیز و وا کن دیدۂ مخمور را
دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را

۱- رموز ، ص ۱۶۴ -

غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است

امتحانِ ممکناتِ مسلم است[۲]

رومی

اے مہِ تاباں چہ خواہی کرد گرد

اے کہ خور درپیشِ رویت روی زرد[۳]

خدمتت بر جملہ ہستی مفترض

جوہرے چوں عجز دارد با عرض[۴]

توضیحات :

تسخیر کا مفہوم رومی کے اس مصرعے میں ''اے کہ خور درپیش رویت روی زرد'' (۳) اور پھر اس مصرعے میں : ''خدمتت برجملہ ہستی مفترض'' (۴) قرآن حکیم کی آیات سے مستفاد ہے -

☆ ☆ ☆

---

۲ - رموز ، ص ۱۶۵ -

۳- مثنوی ، ۵ ، ص ۲۳۹ ، س ۱۳ -

۴- مثنوی ، ۵ ، ص ۳۳۹ ، س ۱۶ -

۲۴

جہادِ زندگی ۔ تسخیرِ موانع و مشکلات

اقبال

چیست اصلِ دیدۂ بیدارِ ما
بست صورت لذتِ دیدارِ ما
کبک پا از شوخیِ رفتار یافت
بلبل از سعیِ نوا منقار یافت
دست و دندان و دماغ و چشم‌وگوش
فکر و تخییل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت
بہرِ حفظِ خویش این آلات ساخت[1]

رومی

زانکہ بیحاجت خداوندِ عزیز
می نہ بخشد ہیچ کس را ہیچ چیز

۱- اسرار ، ص ۱۷ -

گر نبودے حاجتِ عالم زمیں
نافریدے ، هیچ رب العالمیں

ویں زمینِ مضطرب محتاج کوه
گر نبودے نافریدے پُر شکوه

ور نبودے حاجتِ افلاک هم
هفت گردوں نافریدے از عدم

پس کمند هستها حاجت بود
قدر حاجت مرد را آلت بود

پس بیفزا حاجت ، اے محتاج زود
تا بجوشد از کرم دریاے جود[۲]

هر چه روئید از پیِ محتاج رست
تا بیابد طالبے چیزے که جست

حق تعالی کایں سماوات آفرید
از برائے دفعِ حاجات آفرید

هر که جویا شد بیابد عاقبت
سایهٔ در دست و اصلِ مرحمت

هر کجا دردے ، دوا آنجا رود
هر کجا فقرے ، نوا آنجا رود

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۹ ، س ۱۳ تا ۱۶ -

هر کجا مشکل ، جواب آنجا رود
هر کجا پستیست ، آب آنجا رود

زرعِ جانرا کش جواهر مضمر است
ابر رحمت پُر ز آب کوثر است[۳]

زانکہ ظاهر خاک اندوه و بکاست
در درونش صد هزاران خنده هاست

ظاهرش از تیرگی افغان کنان
باطنِ او گلستان در گلستان[۴]

پس بصورت آدمی فرعِ جهان
در صفت اصلِ جهان این را بدان

ظاهرش را پشۂ آرد بچرخ
باطنش باشد محیطِ هفت چرخ[۵]

قالب از ما هست شد ، نے ما ازو
باده از ما مست شد ، نے ما ازو[۶]

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۹ ، س ۳ تا ۵ ، ۸ -
۴- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۲ ، س ۱۸ ، ۲۳ -
۵- مثنوی : ۴ ، ص ۲۷۶ ، س ۱۵ -
۶- مثنوی : ۱ ، ص ۳۷ ، س ۳۴ -

آدمی چوں نور گیرد از خدا
هست مسجودِ ملائک زاجتبا[۷]

پس بصورت عالمِ اصغر توئی
پس بمعنی عالمِ اکبر توئی
ظاهرا آں شاخ اصلِ میوہ است
باطناً بہر ثمر شد شاخ هست
گر نبودے میل و امیدِ ثمر
کہ نشاندے باغباں بیخِ شجر
پس بمعنی آں شجر از میوہ زاد
گر بصورت از شجر بودش نہاد
گر بصورت من ز آدم زادہ ام
من بمعنی جدِ جد افتادہ ام
پس ز من زائیدہ در معنی پدر
پس زمیوہ زاد در معنی شجر[۸]

جوهراست انسان و چرخ او را عرض
جملہ فرع و سایہ اند و تو غرض[۹]

۷- مثنوی : ۲ ، ص ۹۹ ، س ۳۷ -
۸- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۴ ، س ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۵ -
۹- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۹ ، س ۱۵ -

توضیحات :

رومی نے اس موضوع کے مختلف پہلو بیان کرتے ہوئے کہا ہے :

پس کمند هست ها حاجت بود
قدرِ حاجت مرد را آلت بود

اقبال نے یوں کہا ہے :

زندگی مرکب چو در جنگاه باخت
بهر حفظ خویش این آلات ساخت

دونوں کے ہاں پوری بحث "آلات" کی ہے اور پیغام یہی ہے کہ موانع و مشکلات کو بھی انسان کے ممکنات کے بروئے کار لانے میں آلات اور وسائل کی حیثیت حاصل ہے -

۲۵
جہادِ زندگی ۔ جلال و جمال

اقبال

دلبری بے قاهری جادوگری است
دلبری با قاهری پیغمبری است[1]

رومی

پس هنر آمد هلاکت خام را
کز پیِ دانہ نہ بیند دام را[2]

جان فدا کردن برائے صیدِ غیر
کفرِ مطلق دان و نومیدی ز خیر

۱- زبور ، ص ۲٦۳ -
۲- مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۹ ، س ۳۰ -

ھیں مشو چوں قند پیشِ طوطیاں
بلکہ زھرے شو ، شو ایمن از زیاں[۳]

نہ بہند است ایمن و نے دز ختن
آنکہ خصمِ اوست سایۂ خویشتن[۴]

توضیحات :

رومی نے ''ھنر'' (۲) کہا ہے ، اقبال نے ''دلبری'' (۱)۔ ''قاھری'' (۱) کا جو تصوّر اقبال نے دیا ہے وہ رومی کی زبان میں ''زھرے شو'' (۳) میں مضمر ہے ۔ اسی طرح جس فن کاری کو اقبال نے ''دلبری بے قاھری'' کا نام دیا ہے وہ رومی کی زبان میں ''قند پیشِ طوطیاں'' (۱) ہے اور یہ الفاظ اُس آرٹ کے لیے کس قدر پُرمعنی ہیں جو ''قاھری'' کے عنصر سے محروم ہو ۔

☆ ☆ ☆

۳- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۰ ، س ۲۴ ۔
۴- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۰ ، س ۱ ۔

۲۶

جہادِ زندگی ۔ جنگ و جہاد

اقبال

جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری است
جنگِ مومن سنّتِ پیغمبری است

جنگِ مومن چیست ؟ ہجرت سوے دوست
ترکِ عالم ، اختیارِ کوے دوست

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت
جنگ را رہبانیِ اسلام گفت[1]

رومی

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ[2]

۱- جاوید ، ص ۲۱۸ -

۲- مثنوی : ٦ ، ص ۳۵۹ ، س ۳۵ -

توضیحات :

رومی نے اپنے شعر (۲) میں اس حدیثِ نبوی سے استفادہ کیا ہے : ''لا رھبانیة فی الاسلام ۔ علیکم بالجھاد فانه رھبانیة امتی'' الخ ۔ یعنی اسلام میں رہبانیت نہیں ہے ۔ جہاد کے لیے کمربستہ رہو ۔ میری امت کی رہبانیت یہی ہے ۔

اسی حکم کے مطابق رومی نے کہا : ''مصلحت در دین ما جنگ و شکوه'' ۔ اقبال نے اسی حکم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا : ''جنگ را رهبانیِ اسلام گفت'' ۔

۲۷

جہادِ زندگی ۔ جہد للبقاء

اقبال

خود فریبی ہاے او عینِ حیات

همچوگل از خوں وضو عینِ حیات

بہرِ یک گل خونِ صد گلشن کند

از پیِ یک نغمہ صد شیون کند[1]

رومی

گندمے را زیرِ خاک انداختند

پس ز خاکش خوشہ ہا برساختند

بارِ دیگر کوفتندش زآسیا

قیمتش افزود و ناں شد جانفزا

۱- اسرار ، ص ۱۲ ، ۱۳ -

باز نان را زیرِ دندان کوفتند
گشت عقل و جان و جسمِ سودمند
باز آن جان چون بحق او محو شد
باز ماند از سکر و سوے صحو شد
عالمے را زان صلاح آمد ثمر
قومِ دیگر را فلاحِ منتظر[۲]

اینچنیں معدوم کو از خویش رفت
بہترینِ هستها افتاد زفت
او به نسبت با حیاتِ حق فناست
در حقیقت در فنا او را بقاست[۳]

در وجودِ آدمی جان و روان
میرسد از غیب چون آب روان
هر زمان از غیب نو نو می رسد
واز جهانِ تن برون شو می رسد[۴]

۲- مثنوی : ۱ ، ص ۶۳ ، س ۱۶ ، ۱۷ -
۳- مثنوی : ۳ ، ص ۲۲۲ ، س ۱۷ -
۴- مثنوی : ۱ ، ص ۴۵ ، س ۳۰ -

چوں شگوفہ ریخت ، میوہ سر کند
چونکہ تن بشکست ، جاں سر برکند[5]

آں کسے را کہ چنیں شاہے کشد
سوے تخت و بہتریں جاہے کشد
نیم جاں بستاند و صد جاں دھد
آنچہ در وہمت نیاید آں دھد[6]

تو مکن تہدیدم از کشتن کہ من
تشنۂ زارم بخونِ خویشتن
گر بریزد خونِ من آں دوست رو
پاے کوباں جاں بر افشانم بر او
آزمودم ، مرگِ من در زندگیست
چوں رہم زیں زندگی ، پایندگیست[7]

پیشِ بیحد ہرچہ محدود است لاست
کل شئی غیر وجہ اللہ فناست
ایں فناھا پردۂ آں وجہ گشت
چوں چراغِ خفتہ اندر زیر طشت[8]

۵- مثنوی : ۱ ، ص ۵۹ ، س ۱۴ -
۶- مثنوی : ۱ ، ص ۷ ، س ۱۷ ، ۱۸ -
۷- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۸ ، س ۳۵ ، ۳۷ ، ۳۸ -
۸- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۹ ، س ۱ تا ۶ -

توضیحات :

اقبال نے یہاں ارتقاے حیات میں فنا و بقا اور وجود و عدم کے مراحل کو گل و گلشن کی علامتوں میں بیان کیا ہے جیسے اپنے اُردو کے اس مشہور شعر میں :

ودامِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے !

رومی نے کہا تھا : ''چوں شگوفہ ریخت میوہ سر کند'' (۵) ۔ اس مفہوم کے بیان میں اقبال نے ''از خوں وضو'' (۱) اور ''خونِ صد گلشن'' (۱) کا مجازی طریقِ اظہار اختیار کیا ہے ۔ یہ رومی کے اس اندازِ بیان کی پیروی ہے : ''گر بریزد خونِ من آں دوست رو'' (۷) ۔

۲۸

جہادِ زندگی ۔ سوز و سازِ حیات

اقبال

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند
ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند[1]

زندگیِ سوز و ساز بہ ز سکونِ دوام
فاختہ شاہیں شود از تپش زیرِ دام
ہیچ نیاید ز تو غیرِ سجودِ نیاز
خیز چو سروِ بلند، اے بعمل سست گام
خیز کہ بنمایمت مملکتِ تازۂ
چشمِ جہاں بیں کشا بہرِ تماشا خرام
بازوے شاہیں کشا خونِ تدرواں بریز
مرگ بود باز را زیستن اندر کنام

۱- ارمغان، ص ۱۷۷ -

تو نہ شناسی حضور ذوق بمیرد ز وصل

چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام[۲]

رومی

جنگِ ما و صلحِ ما در نور عین

نیست از ما ، ہست بین الاصبعین

جنگ فعل و جنگ طبع و جنگ قول

درمیانِ جزوہا حربیست ہول

این جہان زین جنگ قائم می بود

در عناصر در نگر تا حل شود

چار عنصر چار استونِ قویست

کہ بر ایشان سقفِ دنیا مستویست

ہر ستونے اشکنندۂ آن دگر

استنِ آب اشکنندۂ ہر شرر

بس بنائے خلق بر اضداد بود

لاجرم جنگی شدند از ضرّ و سود

ہست احوالت خلافِ یک دِگر

ہر یکے باہم مخالف در اثر

۲- پیام ، ص ۹۸ ، ۹۹ -

چونکہ ہردم راہ خود را میزنی
با دگر کس سازگاری می‌کنی

تا مگر زیں جنگ حقت واخرد
در جہانِ صلحِ یک رنگت برد

آں جہاں جز باقیِ آباد نیست
زانکہ ترکیب وے از اضداد نیست

ایں تفانی از ضد آمد ضدّ را
چوں نباشد ضد ، نباشد جز بقا

نفیِ ضد کرد از بہشتِ بے نظیر
کہ نباشد شمس و ضدّش زمہریر[۳]

گفتم کہ یافت می نشود جستہ‌ایم ما
گفت‌آنکہ یافت می‌نشود ، آنم آرزوست[۴]

توضیحات :

اقبال کے اشعار میں جس کیفیت کی طرف ''ہنگامہ'' (۱) اور ''سوز و ساز'' (۳) کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے ، رومی نے اُسے ''جنگ'' (۳) کہا ہے ۔ اسی طرح جس حقیقت کو اقبال نے ''سکونِ دوام'' (۲) سے تعبیر کیا ہے ، رومی کے ہاں اس کے لیے لفظ ''صلح''

۳۔ مثنوی : ٦ ، ص ۳۵۲ ، س ۲۴ — ۲۷ ، ۲۹ ، ۳۰ ۔
۴۔ دیوان ، بیت شمارہ ۴٦۴۰ ۔ ملاحظہ ہو اس بیت سے متعلق ہمارا حاشیہ ص ۸٦ پر ۔

(۳) آیا ہے ۔ اقبال کا مصرع ''چیست حیات دوام سوختن ناتمام''
(۲) اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہا ہے جس کی ترجمانی رومی نے یہ
کہہ کر کی ہے : ''این جہان زین جنگ قایم می بود'' (۳) ۔ اقبال
نے ''شاہین'' کو ''تدرو'' (۲) پر حملہ آور بتایا ہے ۔ رومی نے
عناصر کی جنگ (۳) دکھا کر زندگی کی حقیقت سمجھائی ہے ۔

☆ ☆ ☆

۲۹

جہادِ زندگی ۔ تسخیرِ حسّ و ادراک

اقبال

حکیماں مردہ را صورت نگارند
یدِ موسیٰؑ ، دمِ عیسیٰؑ ندارند
زمانے با ارسطو آشنا باش
دمے با سازِ بیکن ہم نوا باش
ولیکن از مقامِ شاں گذر کن
مشو گم اندریں منزل ، سفر کن
بہ آں عقلے کہ داند بیش و کم را
شناسد اندرونِ کان و یم را
جہانِ چند و چوں زیرِ نگیں کن
بگردوں ماہ و پرویں را کمیں کن
و لیکن حکمتِ دیگر بیاموز
رہاں خود را ازیں مکرِ شب و روز[1]

۱- زبور ، ص ۲۱۸ -

رومی

گر تو خواهی کت شقاوت کم شود
جهد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتے کز طبع آید وز خیال
حکمتے بے فیضِ نورِ ذوالجلال
حکمتِ دنیا فزاید ظن و شک
حکمتِ دینی برد فوقِ فلک[۲]

بہرِ آں پیغمبرؐ ایں را شرح ساخت
ہر کہ خود بشناخت یزداں را شناخت[۳]

توضیحات :

رومی نے حکمتِ دنیا اور حکمتِ دینی کا فرق بتاتے ہوئے کہا تھا : ''حکمتِ دینی برد فوق فلک'' (۲) - اقبال نے انسان کو یوں پیغام دیا :

و لیکن حکمتِ دیگر بیاموز
رہاں خود را ازیں مکرِ شب و روز(۱)

رومی کے ''فوقِ فلک''(۲) کا اصل مفہوم ''مکرِ شب و روز''(۱) سے رہائی میں بڑی خوبی سے ادا ہوا ہے -

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۸ ، س ۸ ، ۹ -
۳- مثنوی : ۵ ، ص ۳۱۴ ، س ۳۱ -

۳۰

جہادِ زندگی - دوامِ حرکت

اقبال

کیشِ ما مانندِ موجِ تیزگام
اختیارِ جادہ و ترکِ مقام[1]

رومی

کاین تحرّک شد تبرّک را کلید
وز تحرّک گردی ، اے دل مستفید[2]

چون تجلّی کرد اوصافِ قدیم
پس بسوزد وصفِ حادث را گلیم[3]

۱- پیام ، ص ۴۸ -
۲- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۷ ، س ۹ -
۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۵۹ ، س ۱۳ -

در وجودِ آدمی جان و روان
میرسد از غیب چون آبِ روان
هر زمان از غیب نونو می رسد
واز جهانِ تن برون شو می رسد[۴]

چون شگوفہ ریخت ، میوه سر کند
چونکہ تن بشکست ، جان سر بر کند[۵]

چون ز خود رستی ، همہ برهان شوی
چونکہ گفتی بنده ام ، سلطان شوی[۶]

هم ز آتش زاده بودند آں فریق
جزوها را سوے کل باشد طریق[۷]

چونکہ هر جزوے بجوید ارتفاق
چون بود جانِ عزیز اندر فراق
گوید ، اے اجزاے پستِ فرشیم
غربت من تلخ تر ، من عرشیم

۴- مثنوی : ۱ ، ص ۴۵ ، س ۳۰ -
۵- مثنوی : ۱ ، ص ۵۹ ، س ۱۴ -
۶- مثنوی : ۲ ، ص ۹۹ ، س ۲۱ -
۷- مثنوی : ۱ ، ص ۲۰ ، س ۲۰ -

میلِ جاں اندر حیات و در حی است
زانکہ جانِ لامکاں اصلِ وے است[۸]

حال و قالے از ورائے حال و قال
غرق گشتہ در جمالِ ذوالجلال
غرقۂ نے کہ خلاصے باشدش
یا بجز دریا کسے بشناسدش[۹]

عقل جزو از کل پذیرا نیستے
گر تقاضا بر تقاضا نیستے
چوں تقاضا بر تقاضا میرسد
موجِ آب دریا بر اینجا میرسد[۱۰]

توضیحات :

اقبال کے الفاظ ''موج تیزگام'' ''اختیار جادہ'' اور ''ترکِ مقام'' (۱) اسی لفظ ''تحرّک'' (۲) کی تصویر اور تفسیر ہیں جو رومی کے پیغام میں آیا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۸- مثنوی : ۳ ، ص ۲۰۸ ، س ۳۴ ، ۳۵ ۔
۹- مثنوی : ۱ ، ص ۴۵ ، س ۲۵ ۔
۱۰- مثنوی : ۱ ، ص ۴۵ ، س ۲۶ ۔

۳۱

جہادِ زندگی ۔ حرّیتِ عمل

اقبال

عبد گردد یاوه در لیل و نہار
در دلِ حر یاوه گردد روزگار
عبد را تحصیلِ حاصل فطرت است
وارداتِ جانِ او بے ندرت است
دم بدم نو آفرینی کارِ حر
نغمہ پیہم تازه ریزد تارِ حر
عبد را ایّام زنجیر است و بس
بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس
ہمّتِ حر با قضا گردد مشیر
حادثات از دستِ او صورت پذیر
رفتہ و آینده در موجودِ او
دہرہا آسوده اندر زودِ او[1]

۱- اسرار ، ص ۸۳ -

رومی

بند بگسل ، باش آزاد ، اے پسر
چند باشی بندِ سیم و بندِ زر[۲]

کندهٔ تن را ز پای جاں بکن
تا کند جولاں بگردِ ایں چمن[۳]

اختیارے هست ما را در جهاں
حس را منکر نتانی شد عیاں
اختیارِ خود بیں ، جبری مشو
ره رها کردی ، بره آ ، کج مرو[۴]

توضیحات :

رومی اور اقبال دونوں نے انسان کو دعوتِ عمل دی ہے کہ اپنی قوت اختیار کو استعمال کر کے اپنے ممکنات کو بروئے کار لائے۔ اس مقصد کے لیے رومی نے انسان کو "آزاد" (۲) ہوکر اور اقبال نے "حر" (۱) بن کر میدانِ عمل میں آنے کا پیغام دیا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۲۔ مثنوی : ۱ ، ص ۲ ، س ۱۴ ۔
۳۔ مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۹ ، س ۳ ۔
۴۔ مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۹ ، س ۲۸ ۔

۳۲
حکمتِ عالیہ

اقبال

بہ آں عقلے کہ داند بیش و کم را
شناسد اندرونِ کان و یم را
جہانِ چند و چوں زیرِ نگیں کن
بگردوں ماہ و پرویں را کمیں کن
و لیکن حکمتِ دیگر بیاموز
رہاں خود را ازیں مکرِ شب و روز[1]

رومی

گر تو خواہی کت شقاوت کم شود
جہد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتے کز طبع آید، وز خیال
حکمتے بے فیضِ نورِ ذوالجلال

۱- زبور، ص ۲۱۸ -

حکمتِ دنیا فزاید ظنّ و شک
حکمتِ دینی برد فوقِ فلک[۲]

کالۂ حکمت کہ گم کردۂ دل است
پیشِ اہلِ دل یقین آں حاصل است[۳]

حکمتِ قرآن چو ضالۂ مومن است
ہر کسے در ضالۂ خود موقن است[۴]

توضیحات :

یہاں اقبال نے ''حکمتِ دیگر'' (۱) کہہ کر علومِ ظنیہ کی نفی کی ہے - رومی نے صاف کہا ہے :

حکمتِ دنیا فزاید ظن و شک
حکمتِ دینی برد فوقِ فلک(۲)

''فوقِ فلک'' (۲) میں وہ حقیقت مضمر ہے جسے اقبال نے ''مکرِ شب و روز'' (۱) سے رہائی کہا ہے -

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۸ ، س ۸ -
۳- مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۵ ، س ۲۷ -
۴- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۳ ، س ۳۲ -

۳۳

خودی ۔ خدا اور خودی ۔ خدا اور انسان

اقبال

اگر معروف و عارف ذاتِ پاک است
چہ سودا در سرِ ایں مشتِ خاک است[1]

خودی را زندگی ایجادِ غیر است
فراقِ عارف و معروف خیر است
ازو خود را بریدن فطرتِ ماست
تپیدن ، نارسیدن فطرتِ ماست
نہ او بے ما ، نہ ما بے او چہ حال است
فراقِ ما فراق اندر وصال است[2]

۱- زبور ، ص ۲۱۹ -
۲- زبور ، ص ۲۱۹ -

حکمتِ دنیا فزاید ظنّ و شک
حکمتِ دینی برد فوقِ فلک[۲]

کالۂ حکمت کہ گم کردۂ دل است
پیشِ اہلِ دل یقین آن حاصل است[۳]

حکمتِ قرآن چو ضالۂ مومن است
ہر کسے در ضالۂ خود موقن است[۴]

توضیحات :

یہاں اقبال نے ''حکمتِ دیگر'' (۱) کہہ کر علومِ ظنیہ کی نفی کی ہے - رومی نے صاف کہا ہے :

حکمتِ دنیا فزاید ظن و شک
حکمتِ دینی برد فوقِ فلک(۲)

''فوقِ فلک'' (۲) میں وہ حقیقت مضمر ہے جسے اقبال نے ''مکرِ شب و روز'' (۱) سے رہائی کہا ہے -

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۸ ، س ۷ ، ۸ -
۳- مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۵ ، س ۲۷ -
۴- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۳ ، س ۳۲ -

۳۳

خودی ۔ خدا اور خودی ۔ خدا اور انسان

اقبال

اگر معروف و عارف ذاتِ پاک است
چہ سودا در سرِ ایں مشتِ خاک است[1]

خودی را زندگی ایجادِ غیر است
فراقِ عارف و معروف خیر است
ازو خود را بریدن فطرتِ ماست
تپیدن ، نارسیدن فطرتِ ماست
نہ او بے ما ، نہ ما بے او چہ حال است
فراقِ ما فراق اندر وصال است[2]

۱- زبور ، ص ۲۱۹ -
۲- زبور ، ص ۲۱۹ -

جدائی خاک را بخشد نگاهے
دهد سرمایۂ کوهے بہ کاهے[۳]

چہ خوش سودا کہ نالد از فراقش
و لیکن هم ببالد از فراقش
فراقِ او چنان صاحب نظر کرد
کہ شامِ خویش را بر خود سحر کرد[۴]

رومی

اتصالِ بے تکیّف ، بے قیاس
هست رب الناس را با جانِ ناس[۵]

آدم اصطرلابِ اوصافِ علوست
وصفِ آدم مظهرِ آیاتِ اوست
هر چہ دروے می‌نماید عکسِ اوست
همچو عکسِ ماه اندر آب جوست[۶]

خلق را چوں آب داں صاف و زلال
وندرو تاباں صفاتِ ذوالجلال

۳- زبور ، ص ۲۲۰ -
۴- زبور ، ص ۲۲۱ -
۵- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۸ ، س ۲۵ -
۶- مثنوی : ۶ ، ص ۳۹۸ ، س ۲۶ -

علمِ شان و عدلِ شان و لطفِ شان
چون ستارهٔ چرخ در آبِ روان[۷]

اینت خورشیدے نہاں در ذرۂ
شیرِ نر در پوستینِ برۂ
اینت دریاے نہاں در زیرِ کاہ
پا بریں کہ ، ہیں منہ با اشتباہ[۸]

توضیحات :

رومی نے خدا کے ساتھ انسان کے رشتے کو ''اتصالِ بے تکیف بے قیاس'' (۴) کہا ہے - عین یہی حقیقت اقبال کے الفاظ میں ''فراق اندر وصال'' (۲) ہے - چونکہ ''اتصال'' ہے اس لیے ''وصال'' ہے اور پھر چونکہ یہ اتصال کیفیت اور قیاس کی گرفت سے باہر ہے اس لیے ''فراق'' ہے -

☆ ☆ ☆

۷- مثنوی : ۶ ، ص ۳۹۹ ، س ۶ ، ۷ -
۸- مثنوی ۱ ، ص ۵۱ ، س ۸ -

۳۴

خودی ۔ خود شکنی ۔ خود نگری ۔ خود شناسی

اقبال

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز
بہ ناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہیؔ خدا را فاش بینی
خودی را فاش‌تر دیدن بیاموز[1]

رومی

بہر این پیغمبرؐ آن را شرح ساخت
کانکہ خود بشناخت ، یزدان را شناخت[2]

اے خنک آنرا کہ ذات خود شناخت
اندر امن سرمدی قصرے بساخت[3]

۱- ارمغان ، ۱۵۴ -
۲- مثنوی : ۵ ، ص ۳۱۴ ، س ۳۱ -
۳- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۵ ، س ۱۹ تا ۲۱ -

در درون یک ذرہ نورِ عارفی
بہ بود از صد معرّف ، اے صفی
آنکہ آنرا چشمِ دل شد دیدہ بان
دید خواہد چشمِ او عین العیان
با تواتر نیست قانع جانِ او
بل ز چشمِ دل رسد ایقانِ او[۴]

منگر ایں را کہ حقیری یا ضعیف
بنگر اندر ہمّتِ خود ، اے شریف[۵]

توضیحات :

رومی کے الفاظ ''بنگر اندر ہمّتِ خود''(۵) میں خود نگری اور خود شناسی کا پورا پیغام موجود ہے ۔

☆ ☆ ☆

۴۔ مثنوی : ۶ ، ص ۳۱۷ ، س ۱۹ تا ۲۱ ۔
۵۔ مثنوی : ۳ ، ص ۱۵۹ ، س ۴۳ ۔

۳۵

خودی ۔ خود شناسی و خود نگری

اقبال

بخود رس ، از سرِ ہنگامہ برخیز
تو خود را در ضمیرِ خود فرو ریز[1]

رومی

اے خنک آنرا کہ ذاتِ خود شناخت
اندر امن سرمدی قصرے بساخت[2]

این تو کے باشی کہ تو آن اوحدی
کہ خوش و زیبا و سرمستِ خودی
مرغِ خویشی ، صیدِ خویشی ، دامِ خویش
سور خویشی، فرش خویشی ، بام خویش

۱- زبور ، ص ۲۱۶ -
۲- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۵ ، س ۲۰ -

جوہر آں باشد کہ قایم باخود است

آں عرض باشد کہ فرعِ او شد است

گر تو آدم زادہ ای چوں او نشیں

جملۂ ذرات را در خود ببیں

چیست اندر خُم کہ اندر نہر نیست

چیست اندر خانہ کاندر شہر نیست

ایں جہاں خُم است و دل چوں جوے آب

ایں جہاں حجرہ است و دل شہرِ عجاب[۳]

اقبال

اے اسیرِ دوش و فردا در نگر

در دلِ خود عالمِ دیگر نگر

در گلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی

وقت را مثلِ خطے پنداشتی

باز با پیمانۂ لیل و نہار

فکر تو پیمود طولِ روزگار

وقت را مثلِ مکاں گسترده ای

امتیازِ دوش و فردا کرده ای

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۲۲۹ ، س ۸ تا ۱۱ -

اے چو بو رم کردہ از بستانِ خویش
ساختی از دستِ خود زندانِ خویش[۴]

رومی

لامکانے کہ درو نورِ خداست
ماضی و مستقبل و حالش کجاست
ماضی و مستقبلش نسبت بہ توست
ہردو یک چیزند و پنداری کہ دوست[۵]

جملہ تلوینہا ز ساعت خواستست
رست از تلویں کہ از ساعت برست
چوں ز ساعت ساعتے بیروں شوی
چوں نمانی محرمِ بیچوں شوی
ساعت از بے ساعتی آگاہ نیست
زانکہ آنسو جز تحیّر راہ نیست[۶]

ایں جہاں زندان و ما زندانیاں
حفرہ کن زندان و خود را وا رہاں[۷]

۴- اسرار، ص ۸۰، ۸۲ -
۵- مثنوی : ۳، ص ۱۵۵، س ۱۷ -
۶- مثنوی : ۳، ص ۱۷۰، س ۲۳ تا ۲۵ -
۷- مثنوی : ۱، ص ۲۲، س ۳۰ -

توضیحات :

رومی نے اس نفس کو 'زندانی' (۲) کہا ہے جو خود شناس نہ ہو - اقبال نے بھی ایسے انسان سے یوں خطاب کیا ہے : ''ساختی از دستِ خود زندانِ خویش'' (۳) ، یعنی خود شناسی اور خود نگری نہ ہو تو گویا انسان اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ایک زندان کا اسیر بنائے ہوئے ہے جو عدمِ معرفتِ نفس سے یا اقبال کی اصطلاح میں خودی کے بیدار نہ ہونے سے بنا ہے -

☆ ☆ ☆

۳۶

خودی ۔ خود نگری ۔ شعورِ انا

اقبال

اگر گوئی کہ "من" وہم و گماں است
نمودش چوں نمودِ این و آن است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست ؟
یکے در خود نگر، آں بے نشاں کیست ؟[1]

رومی

ھیں مکن تعجیل ، اوّل نیست شو
چوں غروب آری برآ از شرقِ نو
از انائے در ازل دل تنگ شد
زیں انادل بیخود و جاں دلگ شد

۱- زبور ، ص ۲۳۷ -

آں انائے سرد گشت و لنگ شد
این انا خم داده همچوں چنگ شد
زاں انائے بی انا خوش گشت جاں
شد جہاں او از انائے بے جہاں
از انا چوں رست ، شد اکنوں انا
آفریں بر آں انائے بی عنا
کو گریزاں و انا اندر پیش
می دود چوں دید وے را بے ویش
طالبِ اویی ، نگردد طالبت
چوں بمردی طالبت شد مطلبت
زندۂ ، کے مردہ شو شوید ترا
طالبی ، کے مطلبت جوید ترا
اندریں بحث ار خرد رہ بیں بدے
فخر رازی رازدار دیں بدے
لیک چوں من لم یذق لم یدر بود
عقل و تخییلات او حیرت فزود
کی شود کشف از تفکّر ایں انا
آں انا مکشوف شد بعد از فنا
می‌فتد ایں عقل ها در افتقاد
در مغاکِ حلول و اتحاد[۲]

۲- مثنوی : ۵ ، ص ۳۴۸ ، س ۳۴ تا ۳۶ - ص ۳۴۹ ، س ۱ تا ۴ -

توضیحات :

رومی کے الفاظ ”برآ از شرق نو“ (۲) ”خود نگری“ (۱) کی صحیح راہ اور روش بتاتے ہیں جس کی طرف اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے : ”یکے در خود نگر“ (۱) -

۳۷

خودی ۔ خود نگری ۔ ظاہر و باطن

اقبال

اسرارِ ازل جوئی ، بر خود نظرے وا کن
یکتائی و بسیاری ، پنہانی و پیدائی[1]

رومی

پس بصورت عالمِ اصغر توئی
پس بمعنی عالمِ اکبر توئی
ظاهرا آں شاخ اصلِ میوه است
باطناً بہرِ ثمر شد شاخ هست
گر نبودے میل و امیدِ ثمر
کے نشاندے باغباں بیخِ شجر
پس بمعنی آں شجر از میوه زاد
گر بصورت از شجر بودش نہاد

۱- پیام ، ص ۲۰۰ -

گر بصورت من ز آدم زاده ام
من بہ معنی جدِ جدِ افتاده ام
پس ز من زائیدہ در معنی پدر
پس ز میوہ زاد در معنی شجر[۲]

آدم اصطرلابِ گردونِ علوست
وصفِ آدم مظہرِ آیاتِ اوست
ہر چہ در وے مینماید عکسِ اوست
ہمچو عکسِ ماہ اندر آب جوست[۳]

خلق را چون آب دان صاف و زلال
وندرو تابان صفاتِ ذوالجلال
علمِ شان و عدلِ شان و لطفِ شان
چون ستارہ چرخ در آبِ روان[۴]

زانکہ ظاہر خاک اندوہ و بکاست
در درونش صد ہزاران قندہاست

۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۴ ، س ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۵ -
۳- مثنوی : ٦ ، ص ۳۹۸ ، س ۲٦ -
۴- مثنوی : ٦ ، ص ۳۹۹ ، س ٦ ، ۷ -

ظاہرش از تیرگی افغان کناں
باطنِ او گلستاں در گلستاں[۵]

پس بصورت آدمی فرعِ جہاں
در صفت اصلِ جہاں ایں را بداں
ظاہرش را پشۂ آرد بچرخ
باطنش باشد محیطِ ہفت چرخ[۶]

اینت خورشیدِ نہاں در ذرۂ
شیرِ نر در پوستینِ برۂ
اینت دریاے نہاں در زیرِ کاہ
پا بریں کہ، ہیں منہ با اشتباہ[۷]

توضیحات :

اقبال کے شعر (۱) میں اجمال ہے جو غزل کے اسلوبِ بیان کا تقاضا ہے - رومی کے اشعار (۲ تا ۶) مثنوی کے ہیں اور ان میں یہی مضمون تفصیل کی صورت میں بیان ہوا ہے - اقبال کے الفاظ رومی کے الفاظ کے ساتھ کامل توافق رکھتے ہیں - اقبال نے کہا ہے ''پیدائی'' (۱) ، رومی کے الفاظ ہیں :''بصورت'' (۲ ، ۵) ''ظاہرا'' (۲)

۵- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۲ ، س ۱۸ ، ۲۳ -
۶- مثنوی : ۴ ، ص ۲۷۶ ، س ۱۵ -
۷- مثنوی : ۱ ، ص ۵۱ ، س ۳ ، ۸ -

''ظاہر'' (۴ ، ۵) - اقبال نے کہا ہے : ''پنہانی'' (۱) - رومی کے الفاظ ہیں : ''بمعنی'' اور ''باطناً'' (۲) ''در درونش'' (۴) ''باطن'' (۴ ، ۵) اور اسی ذیل میں ہے ''در صفت اہل ِ جہاں'' اور ''محیط ِ ہفت چرخ'' (۶) ''خورشید ِ نہاں در ذرۂ'' ''شیر ِ نر در پوستین برۂ'' اور ''دریاے نہاں در زیر ِ کاہ'' - اقبال نے کہا ہے ''یکتائی'' (۱) - رومی کے اشعار میں یہ مفہوم ان لفظوں میں ادا ہوا ہے : ''عالم ِ اصغر'' ''شاخ'' ''بیخ ِ شجر'' ''فرع ِ جہاں'' اور ''ذرۂ'' (۵) - اقبال نے لفظ ''بسیاری'' لا کر جو مفہوم ادا کیا ہے اس کے لیے رومی کے اشعار میں ہے : ''عالم ِ اکبر'' (۱) ''گردون ِ علو'' (۳) ''علم ِ شان و عدل ِ شان و لطف ِ شان'' ''صد ہزاران قندھا'' ''گلستاں در گلستان'' (۴) ''خورشید ِ نہاں'' ''دریاے نہاں'' (۵) - یہ چند اہم اور نمایاں حیثیت کے الفاظ ہیں جن کی نشان دہی کی گئی ورنہ مندرجہ اشعار میں اور دوسرے الفاظ بھی موجود ہیں جو اسی سیاق میں آئے ہیں -

☆ ☆ ☆

۳۸

خودی ۔ ممکناتِ خودی کا تحقق

اقبال

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
زورِ خود را از مہمّاتِ عظیم
ممکناتِ قوّتِ مردانِ کار
گردد از مشکل پسندی آشکار[1]

رومی

چون ز غم شادیت افزودن گرفت
روضۂ جانت گل و سوسن گرفت
آنچہ خوف دیگران آن امن تست
بط قوی از بحر و مرغِ خانہ سست[2]

۱۔ اسرار ، ص ۵۵ ۔
۲۔ مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۰ ، س ۱۴ ، ۱۵ ۔

رنج گنج آمد که رحمتها دروست
مغز تازه شد چو بخراشید پوست[٣]

آن بهاران مضمر است اندر خزان
در بهار است آن خزان مگریز ازان[۴]

من عجب دارم ز جویائے صفا
کو رمد در وقتِ صیقل از جفا[٥]

رنج و غم را حق پیِ آن آفرید
تا بدیں ضد خوشدلی آید پدید[٦]

قند شادی میوهٔ باغِ غم است
ایں فرح زخم است وآں غم مرهم است[٧]

زندگی در مردن و در محنت است
آبِ حیوان در درونِ ظلمت است[٨]

٣- مثنوی : ٢ ، ص ١١٣ ، س ٣٠ -
۴- مثنوی : ٢ ، ص ١١٣ ، س ٣٢ -
٥- مثنوی : ٣ ، ص ٢٠١ ، س ٣٦ -
٦- مثنوی : ١ ، ص ٢٥ ، س ٢٣ -
٧- مثنوی : ٣ ، ص ١٩٧ ، س ٢٢ -
٨- مثنوی : ٦ ، ص ٢٢٣ ، س ٣٩ -

همچنانکہ ذوقِ آں بانگِ الست
در دلے هر مومنیے تا حشر هست
تا نباشد در بلا شاں اعتراض
نے ز امر و نہی حق شاں اعتراض
لقمۂ تلخیے چو شکّر میشود
خار ریحاں ، سنگ گوهر میشود[9]

گر بلا آید ترا ، اندہ مبر
ور زیاں بینی ، غمِ او را مخور
کاں بلا دفعِ بلا هائے بزرگ
واں زیاں منعِ زیانهای سترگ
راحتِ جاں آمد اے جاں فوتِ مال
مال چوں جمع آمد ، اے جاں شد وبال[10]

توضیحات :

نفسِ انسانی کو اپنے ممکنات کے بروے کار لانے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، رومی نے انھیں ''جفاے صیقل'' (۵) کہا ہے جس کا مقصد ''صفا'' (۵) پیدا کرنا ہے ۔ اقبال نے اسی کیفیت کو نفس کی ''مشکل پسندی'' سے تعبیر کیا ہے ۔ شعر (۸) میں رومی نے کہا ہے :

''زندگی در مردن و در محنت است''

☆ ☆ ☆

۹۔ مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۴ ، س ۲۵ ، ۲۶ ۔
۱۰۔ مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۹ ، س ۳۸ ، ۳۹ ۔

۳۹

خودی ـ جان و تن ـ جسم و روح

اقبال

تن و جان را دوتا گفتن کلام است

تن و جان را دوتا دیدن حرام است

بجان پوشیده رمز کائنات است

بدن حالے ز احوال حیات است

عروس معنی از صورت حنا بست

نمود خویش را پیرایه ها بست

حقیقت روے خود را پرده باف است

که او را لذت دل انکشاف است[1]

۱- زبور، ص ۲۱۶، ۲۱۷ -

رومی

بادہ از ما مست شد نے ما ازو
قالب از ما ہست شد نے ما ازو[2]

توضیحات :

رومی نے ''قالب'' (۲) کہا ہے ، اقبال نے ''تن'' (۱) - رومی کے الفاظ ''از ما'' (۲) میں اشارہ روح کی طرف ہے جسے اقبال نے لفظ ''جان'' (۱) لا کر واضح کر دیا ہے -

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۱ ، ص ۳۷ ، س ۳۴ -

۴۰

خودی ۔ روحِ انسانی اور عالمِ مادی ۔ دل اور جہانِ آب و گل

اقبال

برون از خویش می بینی جہاں را
در و دشت و یم و صحرا و کاں را
جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما
ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما
خودی او را بہ یک تارِ نگہ بست
زمین و آسمان و مہر و مہ بست
جہاں غیر از تجلّی ہائے ما نیست
کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست[1]

۱۔ زبور ، ص ۲۱۲ ، ۲۱۳ ۔

رومی

باغ ہا و سبزہ ہا در عینِ جاں
بر بروں عکسش چو در آبِ رواں
آب خیالِ باغ باشد اندر آب
کہ کند از لطفِ آب آں اضطراب
باغ ہا و میوہ ہا اندر دل است
عکسِ لطفِ آں بریں آب و گل است
گر نبودے عکسِ آں سرّو سرور
پس نخواندے ایزدش دارالغرور
ایں غرور آنست یعنی ایں خیال
ہست از عکسِ دل و جانِ رجال[۲]

توضیحات :

اقبال نے ''بروں از خویش'' (۱) کہا ہے جبکہ رومی کے الفاظ ہیں ''بر بروں'' (۲) - پھر اقبال نے ''خویش'' کہہ کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جسے رومی نے ''عین جان'' (۲) قرار دیا ہے - اقبال کے اشعار میں ''در و دشت و یم و صحرا و کان'' (۱) رومی کے الفاظ ''باغہا و سبزہ ہا'' (۲) اور ''باغہا و میوہ ہا'' (۲) کے مقابل ہے اور ''رنگ و بو'' (۱) رومی کے الفاظ ''آب و گل'' (۲) کے مقابل -

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۷ ، س ۳۳ تا ۳۵ -

۴۱

خودی ۔ روح اور کائنات کا باہمی رشتہ ۔ دل کا رشتہ جہانِ آب و گل سے

اقبال

خودی تعویذِ حفظِ کائنات است
نخستیں پرتوِ ذاتش حیات است
حیات از خوابِ خوش بیدار گردد
درونش چوں یکے بسیار گردد
نہ او را بے نمودِ ما کشودے
نہ ما را بے کشودِ او نمودے[1]

رومی

ایں جہاں خم است و دل چوں جوے آب
ایں جہاں حجرہ است و دل شہرِ عجاب[2]

۱- زبور ، ص ۲۲۳ -
۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۹ ، س ۱۱ -

توضیحات :

اقبال کے اشعار میں "یکے" اور "بسیار" (۱) ، رومی کے الفاظ "خم" اور "جوے آب" اور "حجرہ" اور "شہر" (۲) سے ہم آہنگ ہے -

☆ ☆ ☆

۴۲

خودی - زورِ خودی

اقبال

چون حیاتِ عالم از زورِ خودی است

پس بہ قدر استواری زندگی است

قطرہ چون حرفِ خودی از بر کند

هستیِ بے مایہ را گوهر کند[1]

سبزہ چون تابِ دمید از خویش یافت

همتِ او سینۂ گلشن شگافت

چون زمین بر هستیٔ خود محکم است

ماہ پابندِ طوافِ پیهم است

هستیِ مهر از زمین محکم تر است

پس زمین مسحورِ چشمِ خاور است

۱- اسرار ، ص ۱۳ -

چون خودی آرد بہم نیروے زیست
می کشاید قلزمے از جوے زیست[۲]

رومی

از علیؓ میراث داری ذوالفقار
بازوے شیرِ خدا ہستت ، بیار[۳]

زین ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست[۴]

☆ ☆ ☆

۲- اسرار ، ص ۱۵ -
۳- مثنوی : ۵ ، ۳۲۱ ، س ۳۷ -
۴- دیوان ، بیت شمارہ ، ۳۶۳۷ -

۴۳

خودی ۔ سخت کوشی اور صلابت

اقبال

اے کہ می خواہی ز دشمن جاں بری

از تو پرسم قطرہ ای یا گوہری[1]

فارغ از خوف و غم و وسواس باش

پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش

میشود از وے دو عالم مستنیر

ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

در صلابت آبروے زندگی ست

ناتوانی ، ناکسی ، ناپختگی ست[2]

۱- اسرار ، ص ۶۲ -

۲- اسرار ، ص ۶۴ -

رومی

چون نبی السیف بوده است آں رسول
آمّتِ او صفدرانند و فحول
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوه
مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوه
مصلحت داده است هر یک را جدا
مصلحت جو ، گر توئی مردِ خدا[۳]

توضیحات :

رومی کے اشعار میں ''صفدران و فحول'' (۳) اور ''جنگ و شکوہ'' (۳) الفاظ آئے ہیں اور حضور پیغمبر اکرمؐ کے لیے حدیثِ نبوی سے مستخرج الفاظ ''نبی السیف'' (۳) آئے ہیں ۔ اقبال نے ''سخت کوشی'' اور ''سخت گیری'' ، ''پختگی'' اور ''صلابت'' (۲) کا ذکر کیا ہے ۔ یہ صفات رومی کے بیان کردہ اوصاف کا تجزیہ ہیں ۔

☆ ☆ ☆

۳- مثنوی : ٦ ، ص ۳۵۹ ، س ۳۴ ، ۳۵ ۔

۴۴

خودی ـ ضعفِ خودی

اقبال

در صلابت آبروے زندگی است
ناتوانی ، ناکسی ، ناپختگی است[1]

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات[2]

رومی

چون نبی السیف بوده است آن رسولؐ
امتِ او صفدرانند و فحول
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوه
مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوه

۱- اسرار ، ص ۶۴ -
۲- بال ، ص ۲۱۰ -

مصلحت دادہ است ہر یک را جدا
مصلحت جو ، گر توئی مردِ خدا[۳]

زیں ہمرہانِ سست عناصر[۴] دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست[۵]

توضیحات :

اقبال کے الفاظ "ناتوانی" (۱) اور "ضعیفی" (۲) کے پس منظر میں وہ تصوّر کارفرما ہے جو رومی کے اس مصرعے میں ہے :
"زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت" (۳)

☆ ☆ ☆

۳- مثنوی : ۶ ، ص ۲۵۹ ، س ۳۴ ، ۳۵ -
۴- 'اسرارِ خودی' کے شروع میں اور 'جاوید نامہ' (ص ۱۲) میں رومی کا یہ شعر اسی لفظ کے ساتھ ہے ۔ مثنوی کے بعض نسخوں میں اس لفظ کے بجائے "سست عناصر" ہے -
۵- دیوان ، بیت شمارہ ۶۳۲۸ -

۲۵

خودی ۔ ترکِ خوف و بیم

اقبال

فارغ از اندیشۂ اغیار شو

قوّتِ خوابیدہ ای، بیدار شو[1]

تا عصاے لا الٰہ داری بدست

ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش

خم نگردد پیشِ باطل گردنش

خوف را در سینۂ او راہ نیست

خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست[2]

۱۔ رموز، ص ۱۱۴۔

۲۔ اسرار، ص ۴۷ ۔

رومی

گر تو خواهی کت شقاوت کم شود
جہد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتے کز طبع آید وز خیال
حکمتے بے فیض نور ذوالجلال
حکمتِ دنیا فزاید ظن و شک
حکمتِ دینی برد فوقِ فلک[۳]

خاک زن بر دیدۂ حس بین خویش
دیدۂ حس دشمنِ عقل است و کیش
دیدۂ حس را خدا اعماش خواند
بت پرستش خواند و ضدِ ماش خواند
آنکہ او کف دید و دریا را ندید
زانکہ حالے دید و فردا را ندید[۴]

غیرِ آں زنجیرِ زلفِ دلبرم
گر دو صد زنجیر آری ، بر درم[۵]

۳- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۸ ، س ۷ ، ۸ -
۴- مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۳ ، س ۳۴ ، ۳۵ -
۵- مثنوی : ۵ ، ص ۳۱۱ ، س ۱۲ -

گفت آخر از خدا شرمے بدار
می کشی این بے گنہ را زار زار
گفت از چوب خدا این بندہ اش
می زند بر پشت دیگر بندہ خوش[۶]

ھین منہ بر پایم این زنجیر را
کہ دریدم سلسلۂ تدبیر را[۷]

عقل ھا زین سر بود بیروں ز در
زھرۂ وھم ار بدرّد گو بدر
قوس موئے نیست اندر پیش عشق
جملہ قربانند اندر کیش عشق[۸]

توضیحات :

اقبال نے "اغیار" (۱) کہا ہے، رومی نے "غیر" (۵) ۔ رومی کا شعر ہے :

غیر آں زنجیر زلف دلبرم
گر دو صد زنجیر آری، بر درم

۶۔ مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۱ ، س ۲۳ ۔
۷۔ مثنوی : ۶ ، ص ۳۶۱ ، س ۳۰ ، ۳۱ ۔
۸۔ مثنوی : ۵ ، ص ۳۱۵ ، س ۳۹ ، ۴۰ ۔

''بر درم'' (۵) میں ترکِ خوف و بیم ہے اور اس قوّت کے بروے کار آنے کا مظاہرہ ہے جس کی طرف اقبال نے ''قوتِ خوابیدہ'' (۱) کے الفاظ میں اشارہ کیا ہے - رومی کا شعر (۸) اسی قوّت کی بیداری کا ترجمان ہے -

۴٦

خودی ـ قوّت و استیلا

اقبال

زنـدگانی قـوّتِ پیـداستـے
اصلِ او از ذوقِ استیـلاستـے

ناتوانی زندگی را رهزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

با توانائی صداقت تـوأم است
گر خودآگاهی ، همیں جام جم است

زندگی کشت است و حاصل قوّت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوّت است

مدّعی گر مایه‌دار از قوّت است
دعویِ او بے نیاز از حجّت است

باطل از قوّت پذیرد شأنِ حق
خویش را حق داند از بطلانِ حق

از کُنِ او زہر کوثر می شود

خیر را گوید شرے ، شر می‌شود[1]

رومی

چون نبی السیف بوده ست آن رسولؐ

اُمّتِ او صفدرانند و فحول

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوه

مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوه

مصلحت داده است هر یک را جدا

مصلحت جو ، گر توئی مردِ خدا[2]

توضیحات :

اقبال نے ''قوت'' (۱) ، ''ذوقِ استیلا'' (۱) اور ''توانائی'' (۱) اور ''صداقت'' (۱) کا ذکر کر کے صفات کی طرف اشارہ کیا ہے - رومی کے بیان میں بیشتر موصوف مذکور ہیں : ''صفدران'' (۲) ''فحول'' (۲) ''مردِ خدا'' (۲) - رومی نے اس سیاق میں قوت و جلالتِ رسولِؐ اکرم کی طرف توجہ دلانے کے لیے حدیثِ نبوی

۱- اسرار ، ص ۵۵ تا ۵۷ -

۲- مثنوی : ۶ ، ص ۳۵۹ ، س ۳۴ ، ۳۵ -

''انا نبی السیف''(۲) کی تلمیح استعمال کی ہے اور جہاد کی خصوصیات ، ''جنگ و شکوہ'' (۲) کا ذکر کیا ہے - اقبال نے یہاں چونکہ حق اور باطل دونوں کے حوالے سے قوّت و توانائی کی اہمیت بتائی ہے اس لیے مطلق طور پر قوّت اور اس کے لوازم کو بنیاد بنایا ہے -

✡ ✡ ✡

۴۷

خودی ۔ قوّت و استیلائے حق

اقبال

زندگانی قوتِ پیداستے
اصلِ او از ذوقِ استیلاستے
زندگی کشت است و حاصل قوّت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوّت است[1]

رومی

هو پیمبر فرد آمد در جهاں
فرد بود و صد جهانش در نہاں
عالمِ کبریٰ بقدرت سخره کرد
کرد خود را در کہن نقشے نورد

۱- اسرار ، ص ۵۵ ، ۵۶ -

ابلہانش فرد دیدند و ضعیف
کے ضعیف است آنکہ با شہ شد حریف[۲]

این جہادِ اکبر است ، آں اصغر است
ہر دو کارِ رستم است و حیدر است[۳]

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید
ترسد از وے جن وانس و ہر کہ دید[۴]

قطب شیر و صید کردن کارِ او
باقیانِ خلق باقی خوارِ او[۵]

توضیحات :

اس موضوع کے بیان میں اقبال کے مندرجہ اشعار میں ''قوت و استیلا'' (۱) الفاظ آئے ہیں - رومی کے اشعار میں لفظ ''قدرت'' (۲) استعمال ہوا ہے - باقی دوسرے اشعار میں قوت و قدرت کے مظاہر اور مناسبات کا ذکر ہے - اقبال نے ''قوت'' (۱) کو ''رمزِ حق و باطل'' (۱) کہا ہے - رومی کے شعر (۳) میں اس طرح کی تعمیم قوت کے جسمانی اور روحانی ، مادی اور معنوی مظاہر کے لیے ''رستم'' (۳) اور ''حیدر'' (۳) کی تلمیحات میں موجود ہے -

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۱ ، ص ۵۱ ، س ۹ ، ۱۰ -
۳- مثنوی : ۵ ، ص ۳۴۳ ، س ۱۰ -
۴- مثنوی : ۱ ، ص ۳۱ ، س ۱ -
۵- مثنوی : ۵ ، ص ۳۱۸ ، س ۲۷ -

۴۸

خودی اور مرگ

اقبال

ازاں مرگے کہ می‌آید چہ باک است
خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است
ز مرگِ دیگرے لرزد دلِ من
دلِ من ، جانِ من ، آب و گلِ من
ز کارِ عشق و مستی بسر فتادن
شرارِ خود بہ خاشاکے ندادن
ترا ایں مرگ ہردم در کمین است
بترس ازوے کہ مرگِ ما ہمین است[1]

خودی چوں پختہ گردد ، لازوال است
فراقِ عاشقاں عینِ وصال است

۱- زبور ، ص ۲۳۷ -

شرر را تیز بالے میتوان داد
تپیدِ لایزالے می‌توان داد
دوامِ حق جزائے کارِ او نیست
کہ او را این دوام از جستجو نیست
دوام آن بہ کہ جانِ مستعارے
شود از عشق و مستی پایدارے[۲]

روسی

از جمادی مردم و نامی شدم
وز نما مردم ، بحیوان سرزدم
مردم از حیوانی و آدم شدم
پس چہ ترسم ، کے ز مردن کم شدم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر
تا برآرم از ملایک بال و پر
وز ملک ہم بایدم جستن رقو
کلّ شیءٍ ہالک ، الاّ وجہہٗ
بار دیگر از ملک قربان شوم
آنچہ اندر وہم ناید آن شوم

۲- زبور ، ص ۲۳۰ -

پس عدم گردم ، عدم چون ارغنون
گویدم کانّا الیه راجعون[۳]

بادِ تند است و چراغے ابترے
زو بگیرانم چراغے دیگرے
تا بود کز هر دو یک وا می شود
گر ببادے آں چراغ از جا رود
همچو عارف کز تنِ ناقص چراغ
شمعِ دل افروخت از بهرِ فراغ
تاکہ روزے ایں بمیرد ناگہاں
پیشِ چشم خود نہد او شمعِ جاں[۴]

ایں همہ مردن نہ مرگ صورت است
ایں بدن مر روح را چوں آلت است
اے بسا خامے کہ ظاهر خویش ریخت
لیک نفس زنده آں جانب گریخت
آلتش بشکست و رهزن زنده ماند
نفس زنده است ، ارچہ مرکب خوں فشاند
اسپ کشت و راه او رفتہ نشد
جز کہ خام و زشت و آشفتہ نشد

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۹ ، س ۳۷ ، ۳۸ - ص ۲۰۰ ، س ۱ ، ۲ -
۴- مثنوی : ۴ ، ص ۲۶۶ ، س ۲ - ۴ -

کز بہ ہر خونریزئے گشتہ شہید
کافرِ کشتہ بدے ہم بوسعید
اے بسا نفسِ شہیدِ معتمد
مردہ در دنیا چو زندہ میرود
نفسِ رہزن مرد و تن کہ تیغِ اوست
ہست باقی در کفِ آن غزوہ دوست
نفس چون مبدل شود این تیغِ تن
باشد اندر دستِ صنعِ ذوالمنن[5]

صورتِ تن گو برو ، من کیستم
نقش کم ناید ، چو من باقیستم
چون نفخت بودم از لطفِ خدا
فتحِ حق باشم ز نائے تن جدا[6]

تو ازان روزے کہ در ہست آمدی
آتشے یا خاک یا بادے بدی
گر بدان حالت ترا بودے بقا
کے رسیدے مر ترا این ارتقا

۵- مثنوی : ۵ ، ص ۳۴۳ ، س ۲۷ - ۳۱ -
٦- مثنوی : ۳ ، ص ۲۰۰ ، س ۲۱ ، ۲۲ -

از مبدّل هستیِ اوّل نماند
هستیِ بهتر بجاے آں نشاند[7]

بے حجابت باید آں ، اے ذولباب
مرگ را بگزیں و بر در آں حجاب
نے چناں مرگے کہ در گورے روی
مرگ تبدیلے کہ در نورے روی[8]

بلکہ خواهانِ اجل چوں طفل شیر
نہ ز رنجے کہ ترا دارد اسیر
مرگ جو باشی ولے در عجز و رنج
بلکہ بینی در خرابِ خانہ گنج[9]

آں یکے میگفت ، خوش بودے جہاں
گر نبودے پاکِ مرگ اندر میاں
آں دگر گفت ، ار نبودے مرگ هیچ
کہ نیرزیدے جہانِ پیچ پیچ

۷- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۲ ، س ۲ ، ۳ -
۸- مثنوی : ٦ ، ص ۳٦۳ ، س ۳۰ ، ۳۱ -
۹- مثنوی : ۴ ، ص ۲۵٦ ، س ۲۰ -

خرمنے بودے بدشت افراشته
مهمل و ناکوفته بگذاشته
مرگ را تو زندگی پنداشتی
تخم را در خاکِ شوره کاشتی[10]

پاے در دریا منه کم گو ازآں
بر لبِ دریا خمش کن لب گزاں
گرچه صد چوں من ندارد تابِ بحر
لیک من نشکیبم از غرقابِ بحر
جان و عقلِ من فداے بحر باد
خونبهای عقل و جاں ایں بحر داد
تا که پایم میرود رانم درو
چوں نماند پا چو بطّانم درو[11]

من غلام آنکه نفروشد وجود
جز بداں سلطان بافضالِ وجود
من غلامِ آں مسِ همت پرست
که بغیرِ کیمیا نارد شکست[12]

۱۰- مثنوی : ۵ ، ص ۳۰۹ ، س ۲ ، ۳ -
۱۱- مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۰ ، س ۲ ، ۳ -
۱۲- مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۷ ، س ۱ ، ۲ -

عاشقاں در سیلِ تیز افتادہ اند
بر قضائے عشق دل بنہادہ اند
ہمچو سنگِ آسیا اندر مدار
روز و شب گردان و نالاں بیقرار
گردشش بر جوئے جویاں شاہد است
تا نگوید کس کہ آں جو راکد است
گر نمی بینی تو جو را در کمیں
گردشِ دولابِ گردونی ببیں[۱۳]

جسم ہا چوں کوزہ ہائے بستہ سر
تا کہ در ہر کوزہ چبود آں نگر
کوزۂ آں تن پر از آبِ حیات
کوزۂ ایں تن پر از زہر ممات[۱۴]

توضیحات :

رومی نے موت کے بعد بقا کی طرف اشارہ یوں کیا ہے :
''برآرم از ملایک بال و پر'' (۳) اور :

بار دیگر از ملک قرباں شوم
آنچہ اندر وہم ناید آں شوم (۳)

۱۳- مثنوی : ۲ ، ص ۳۶۶ ، س ۱۳ ، ۱۴ -
۱۴- مثنوی : ۲ ، ص ۳۶۲ ، س ۱۲ ، ۱۳ -

اس بلند پروازی کا راز ہے ''عشق و مستی'' جسے اقبال نے آشکار کر دیا ہے :

دوام آں بہ کہ جان مستعارے
شود از عشق و مستی پایدارے (۲)

رومی نے جس ''چراغِ دیگرے'' (۴) ''شمعِ دل'' (۴) اور ''شمع جاں'' (۴) کے روشن کرنے کا ذکر کیا ہے وہ اسی ''عشق و مستی'' (۲) کا فروغ ہے -

☆ ☆ ☆

۴۹

خودی کا مستقبل

اقبال

جہان یکسر مقامِ آفلین است
دریں غربت سرا عرفاں ہمیں است
دلِ ما در تلاشِ باطلے نیست
نصیبِ ما غمِ بے حاصلے نیست
نگہ دارند اینجا آرزو را
سرور و ذوق و شوقِ جستجو را
خودی را لازوالے میتواں کرد
فراقے را وصالے میتواں کرد[1]

بہ بحرش گم شدن انجامِ ما نیست
اگر او را تو در گیری فنا نیست

۱- زبور ، ص ۲۳۱ -

خودی اندر خودی گنجد محال است

خودی را عینِ خود بودن کمال است[٢]

اگر مائیم ، گردانِ جامِ ساقی ست

بہ بزمش گرمیِ ہنگامہ باقی ست

مرا دل سوخت بر تنہائیِ او

کنم سامانِ بزم آرائیِ او

مثالِ دانہ می کارم خودی را

برائے او نگہ دارم خودی را[٣]

رومی

گوہر جان چون ورائے فصلہاست

خوی او این نیست خوے کبریاست[٤]

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش

باز جوید روزگار وصل خویش[٥]

٢- زبور ، ص ٢٢٢ -

٣- زبور ، ص ٢٣٢ -

٤- مثنوی : ٦ ، ص ٣٥٣ ، س ٢ -

٥- مثنوی : ١ ، ص ٢ ، س ٢ -

بے تعلق نیست مخلوقے بدو
آں تعلق ہست بیچوں ، اے عمو
زانکہ وصل و فصل نبود در رواں
غیر فصل و وصل لندیشد گماں
غیر فصل و وصل پے بر از دلیل
لیک پے بردن نیندیشد علیل
پے پیاپے می‌بر از دوری ز اصل
تا رگِ مردیت آرد سوے وصل
ایں تعلق را خرد چوں راہ برد
بستہٴ فصل است ووصل است ایں خرد[6]

توضیحات :

رومی نے روحِ انسانی کا مستقبل ان الفاظ میں بتایا ہے :

گوھر جاں چوں ورائے فصل ھاست
خوی او این نیست خوی کبریا ست (۴)

اقبال نے بقائے روح کی توجیہ یوں کی ہے :

اگر مائیم ، گرداں جامِ ساقی است
بہ بزمش گرمیِ ہنگامہ باقی است (۳)

۶- مثنوی : ۴ ، ص ۴۷۲ ، س ۳ ، ۵ -

اور کہا ہے : ''برائے او نگہ دارم خودی را'' (۳) ۔ اقبال کے یہ حکیمانہ اور فنکارانہ الفاظ رومی کے اس قول کی نہایت پُرمعنی اور دلکش تفسیر ہیں کہ روح کی اصل حقیقت انفصال و انقطاع سے ماوراء ہے اور اس کا یہ وصف اس کی اپنی صفت نہیں ، ذاتِ کبریا کا پرتو ہے ۔ اسی نکتے کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے :

''اگر او را تو در گیری ، فنا نیست'' (۲)

۵۰

خیر و شر ۔ ذوقِ ترک و اختیار

اقبال

در گذشتم از سجود اے بے خبر
ساز کردم ارغنونِ خیر و شر
تا نصیب از دردِ آدم داشتم
قہرِ یار از بہرِ او نگذاشتم
شعلہ ہا از کشت زارِ من دمید
او ز مجبوری بہ مختاری رسید
زشتیِ خود را نمودم آشکار
با تو دادم ذوقِ ترک و اختیار[1]

بے نیاز از نیش و نوشِ من گذر
تا نگردد نامہ ام تاریک تر[2]

۱- جاوید ، ص ۱۵۸ ، ۱۵۹ -
۲- جاوید ، ص ۱۵۹ -

رومی

پس بدِ مطلق نباشد در جہاں
بد بہ نسبت باشد ، ایں را ہم بداں
در زمانہ ہیچ زہر و قند نیست
کہ یکے را پا دگر پیوند نیست
ہر یکے شد با دگر یک پاے بند
مر یکے را زہر و دیگر را چو قند
زہرِ ماراں ، مار را باشد حیات
نسبتش با آدمی باشد ممات
خلقِ آبی را بود دریا چو باغ
خلقِ خاکی را بود آں درد و داغ[۳]

صورتِ ہر نعمتے و زحمتے
ہست ایں را دوزخ ، آنرا جنتے[۴]

چوں عدو نبود ، جہاد آمد محال
شہوت ار نبود ، نباشد امتثال
صبر نبود ، چوں نباشد میلِ تو
خصم چوں نبود چہ حاجت خیلِ تو

۳- مثنوی : ۴ ، ص ۲۱۷ ، س ۸ تا ۱۰ -
۴- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۴ ، س ۳۲ -

هین مکن خود را خصی ، رهبان مشو
زانکہ عفّت هست شهوت را گرو
بے هوا نہی از هوا ممکن نبود
هم غزا بر مردگاں نتواں نمود۵

توضیحات :

اقبال نے شرِ ابلیس کو ''شعلہ'' اور ''زشتی'' (۱) سے تعبیر کیا ہے ۔ رومی نے ''عدو'' (۴) کا لفظ لا کر ، جو ابلیس کے لیے قرآن حکیم میں آیا ہے ، اسی ''شر'' کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اسی طرح لفظ ''خصم'' (۴) بھی قرآن پاک کے ''خصیم مبین'' سے مستفاد ہے ۔ اقبال نے ابلیس کی زبان سے ابنِ آدم کے لیے یہ الفاظ ادا کرا کر ''بے نیاز از نیش و نوشِ من گذر'' (۲) انسان کی اس فعالیت کو نمایاں کیا ہے جس کے لیے اس سیاق میں رومی کے الفاظ ہیں : ''جہاد'' (۴) اور ''غزا'' (۴) ۔ اقبال نے ''خیر و شر'' (۱) الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ رومی کے ہاں اسی حقیقت کے لیے ''زہر و قند'' (۳) کا استعارہ آیا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۵- مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۸ ، س ۱۶ تا ۱۸ ۔

۵۱

خیر و شر ۔ حقیقتِ شر

اقبال

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست

گفتا مئے کہ تلخ ترِ او نکوتر است

گفتم کہ شر بفطرتِ خامش نہادہ اند

گفتا کہ خیرِ او لشناسی همین شراست[1]

رومی

پس بدِ مطلق نباشد در جہاں

بد بہ نسبت باشد ، این را هم بدان

در زمانہ هیچ زہر و قند نیست

کہ یکے را با دگر پیوند نیست

۱- پیام ، ص ۱۳۶ -

هر یکے شد با دگر یک پاے بند
مر یکے را زهر و دیگر را چو قند

زهرِ ماران ، مار را باشد حیات
نسبتش با آدمی باشد ممات

خلقِ آبی را بود دریا چو باغ
خلقِ خاکی را بود آں درد و داغ[۲]

صورتِ هر نعمتے و زحمتے
هست ایں را دوزخ ، آں را جنّتے[۳]

توضیحات :

اس موضوع کے ضمن میں ، کہ انسان کے لیے خیر و شر نسبی اور اضافی ہیں اور زندگی قوّتِ شر کو مسخّر کر کے خیر پیدا کرتی ہے ، اقبال اور رومی دونوں کے شاعرانہ بیان میں شر کے لیے تلخی کا تصوّر مشترک ہے ۔ اقبال کے پہلے شعر (۱) میں لفظِ ''تلخ'' رومی کے دوسرے شعر (۲) کے لفظ ''زہر'' کے زیر اثر معلوم ہوتا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۱۷ ، س ۸ - ۱۰ ۔
۳- مثنوی : ۵ ، ص ۳۳۴ ، س ۳۲ ۔

۵۲

خیر و شر ۔ رابطۂ خیر و شر

اقبال

چہ گویم نکتۂ زشت و نکو چیست

زباں لرزد کہ معنی پیچ‌دار است

بروں از شاخ بینی خار و گل را

درونِ او نہ گل پیدا، نہ خار است[1]

رومی

روز و شب، ظاہر دو ضد و دشمن اند

لیک ہر دو، یک حقیقت می تنند

ہر یکے خواہاں دگر را ہمچو خویش

از پیِ تکمیلِ کار و فعلِ خویش

۱- پیام، ص ۵۴ -

زانکہ بے شب دخل نبود طبع را
پس چہ اندر خرج آرد روز ها[۲]

مصطفیٰ فرمود از گفت جحیم
کہ بہ مومن لابہ گر گردد ز بیم
گویدش بگذر ز من ، اے شاہ زود
ہیں کہ نورت سوز نارم را ربود
پس ہلاک تازہ نور مومن است
زانکہ بے ضد ، دفعِ ضد لایمکن است
نار ضدِّ نور باشد ، روز عدل
کاں ز قہر انگیختہ شد ، ویں ز فضل
گر همی‌خواهی تو دفعِ شرِّ نار
آبِ رحمت در دلِ آتش گمار
چشمۂ آں آب رحمت مومن است
آب حیواں روح پاک محسن است[۳]

از محبّت خارها گل میشود
وز محبّت سرکہ ها مُل میشود

۲- مثنوی : ۳ ، ص ۲۰۸ ، س ۲۲ - ۲۳ -
۳- مثنوی : ۲ ، ص ۹۸ ، س ۱۳ - ۱۶ -

از محبّت نار نورے میشود
از محبّت، دیو حورے میشود
ایں محبّت هم نتیجهٔ دانش است
کے گزافه بر چنیں تختے نشست
دانشِ ناقص کجا ایں عشق زاد
عشق زاید ناقص امّا بر جماد[۴]

در مقامے خار و در جائے چو گل
در مقامے سرکه، در جائے چو مُل
ایں چنیں باشد تفاوت در امور
مردِ کامل ایں شناسد در ظهور[۵]

توضیحات :

اقبال نے "زشت و نکو" (۱) کی بحث میں "خار و گل"(۱) کی مثال دی ہے - رومی نے اس موضوع کے بیان میں متعدد اضداد کا ذکر کیا ہے جن میں "خار و گل" (۴ ، ۵) بھی ہیں -

☆ ☆ ☆

۴- مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۲ ، س ۲۷ ، ۲۸ ، ۳۱ ، ۳۲ -
۵- مثنوی : ۱ ، ص ۵۲ ، س ۳۱ ، ۳۶ -

۵۳

خیر و شر - پیکارِ خیر و شر

اقبال

صد جہان پوشیدہ اندر ذاتِ او
غیر او پیداست از اثباتِ او
در جہان تخمِ خصومت کاشت ست
خویشتن را غیرِ خود پنداشت ست
سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذتِ پیکار را[1]

رومی

حق تعالٰی گرم و سرد و رنج و درد
بر تنِ ما می نہد اے شیر مرد

۱- اسرار، ص ۱۲ -

خوف و جوع و نقصِ اموال و بدن
جمله بهرِ نقدِ جان ظاهر شدن[۲]

با قضا پنجه زدن نبود جهاد
زانکه این را هم قضا بر ما نهاد[۳]

جهد کن تا نور تو رخشان شود
تا سلوکِ این رهت آسان شود
جهد کن تا مزدِ طاعت در رسد
بر مطیعان آنگهت آید حسد[۴]

آنکه گوید جمله حق است احمقی است
وانکه گوید جمله باطل او شقی است[۵]

چون عدو نبود جهاد آمد محال
شهوت ار نبود نباشد امتثال[۶]

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۴ ، س ۲۹ -
۳- مثنوی : ۱ ، ص ۲۲ ، س ۲۷ -
۴- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۱ ، س ۱۶ ، ۱۸ -
۵- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۴ ، س ۱۷ -
۶- مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۸ ، س ۱۶ -

در حقیقت ہر عدو داروے تست
کیمیاے نافع و دل جوے تست
زیں سبب بر انبیا رنج و شکست
از ہمہ خلقِ جہاں افزوں تر است[۷]

توضیحات :

اقبال نے خیر و شر کے تصادم کی اہمیت بتاتے ہوئے ''لذتِ پیکار''(۱) کی جو ترکیب استعمال کی ہے ، اس کا مأخذ رومی کا یہ مصرع ہے :

''چوں عدو نبود جہاد آمد محال''

''پیکار'' (۱) کا لفظ ''جہاد'' (۶) کا تصوّر دے رہا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۷- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۷ ، ص ۳۳ ، ۳۶ ۔

۵۲

خیروشر ۔ قوّتِ شر

اقبال

پیکرِ انجم ز تو ، گردشِ انجم ز من
جان بجہان اندرم زندگیِ مضمرم
تو بہ بدن جان دہی ، شور بجان من دہم
تو بہ سکوں رہ زنی ، من بہ تپش رہبرم
آدمِ خاکی نہاد ، دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوش تو ، پیر شود در برم[1]

رومی

شہوتِ دنیا مثالِ گلخن است
کہ ازو حمامِ تقویٰ روشن است[2]

۱- پیام ، ص ۱۴ -
۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۱۹ ، س ۳۵ -

من سبب را ننگرم کو حادث است
زانکہ حادث حادثے را باعث است

لطفِ سابق را نظارہ می کنم
وانچہ او حادث دوبارہ می کنم

ترکِ سجدہ از حسد کردم کہ بود
ایں حسد از عشق خیزد، نے جحود

ایں حسد از دوستی خیزد یقیں
کہ شود با دوست غیرے همنشیں[۳]

خاصہ دزدے چوں تو قطّاع الطریق
از چہ رو گشتی چنیں بر من شفیق

گفت، ما اوّل فرشتہ بودہ ایم
راہِ طاعت را بجاں پیمودہ ایم

سالکانِ راہ را محرم بدیم
ساکنانِ عرش را همدم بدیم

ما هم از مستانِ ایں مے بودہ ایم
عاشقانِ درگہِ وے بودہ ایم

پیشۂ اوّل کجا از دل رود
مهرِ اوّل کے ز دل زایل شود[۴]

۳- مثنوی : ۲، ص ۱۱۹، س ۲۹ — ۳۱ -
۴- مثنوی : ۲، ص ۱۱۹، س ۱۶، ۱۸ — ۲۰ -

توضیحات :

اقبال نے ''شر'' سے ''خیر'' کا رشتہ ''تپش'' اور ''سکون'' (۱) کا تصوّر دے کر سمجھایا ہے - رومی کے بیان (۲) میں یہ حقیقت ''گلخن'' اور ''حمام'' کی علامتوں میں بیان ہوئی ہے - اس ضمن میں اقبال اور رومی دونوں نے ''شر'' اور ''خیر'' کے زمان آغاز حیات کی طرف اشارہ کیا ہے - رومی نے ''پیشہٴ اوّل'' (۴) الفاظ کے ذریعے اور اقبال نے ''زاد در آغوش تو''(۱) کہہ کر ؛ اور دونوں کے کلام میں یہ الفاظ ابلیس کی زبان سے ہیں - اقبال اور رومی دونوں کے کلام میں یہ موضوع مکالمے کی صورت میں بیان ہوا ہے - یہ مکالمہ اقبال کے ہاں خدا سے ابلیس کے خطاب کی صورت میں ہے اور رومی کے ہاں آدم و ابلیس کے درمیان گفتگو کی صورت میں -

☆ ☆ ☆

۵۵

زندگی ـ حقیقتِ زمان ـ عدم و وجود ـ فنا و بقا

اقبال

ضمیرِ زندگانی جاودانی است
بچشمِ ظاهرش بینی ، زمانی است[1]

رومی

کارگاهِ صنعِ حق در نیستیست
غرّهٔ هستی چه داند نیست چیست[2]

نیست را بنمود هست آن محتشم
هست را بنمود بر شکلِ عدم
بحر را پوشید و کف کرد آشکار
باد را پوشید و بنمودت غبار[3]

۱- زبور ، ص ۲۲۸ -
۲- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۰ ، س ۱۳ -
۳- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۵ ، س ۳۴ -

توضیحات :

حقیقت زمان و مکان اور حقیقتِ عدم و وجود کے بیان کے ضمن میں رومی نے صنعتِ حق کی کارگاہ کا ذکر کیا ہے جو عدم میں پوشیدہ ہے ، اور کہا کہ زندگی کے ظواہر کی فریب خوردہ نظر والا نہیں سمجھ سکتا کہ یہ عدم کیا ہے ۔ خالقِ کائنات نے عدم کو وجود بنایا اور وجود کو عدم کی صورت میں ظاہر کیا ۔ سمندر کو چھپا لیا اور اس کے پھین دکھا دیے ۔ ہوا کو نظروں سے مخفی رکھا ، صرف غبار اڑاتا دکھا دیا ۔ اقبال نے قدرت کی اسی مخفی کارگاہ کے لیے نہایت حکیمانہ لفظ ''ضمیرِ زندگانی'' (۱) استعمال کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ وجود و عدم کے ظواہر سے بالاتر اور مسلسل اور غیر منقطع طور پر کارفرما ہے ۔ رومی کے لفظ ''غرۂ هستی'' (۲) کے مقابل اقبال نے ''چشم ظاہر'' (۱) کہا ہے جس سے مظاہرِ ہستی کا صرف حدوث و فنا والا پہلو نظر آتا ہے ۔

✡ ✡ ✡

۵٦

زندگی اور صبر و تحمّل

اقبال

مرغے ز آشیانہ بسیرِ چمن پرید

خارے ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید

بد گفت فطرتِ چمنِ روزگار را

از دردِ خویش و ہم ز غمِ دیگراں تپید

گفت اندریں سرا کہ بنایش فتادہ کج

صبحے کجا کہ چرخ درو شامیانہ چید

سوزِ فغانِ او بہ دلِ ہدہدے گرفت

با نوکِ خویش خار ز اندام او کشید

گفتش کہ سودِ خویش ز جیبِ زیاں برآر

گل از شگافِ سینہ زرِ ناب آفرید

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی[1]

رومی

در مقامے زہر و در جائے دوا
در مقامے کفر و در جائے روا
در مقامے خار و در جائے چو گل
در مقامے سرکہ ، در جائے چو مُل
در مقامے خوف و در جائے رجا
در مقامے منع و در جائے عطا
در مقامے فقر و در جائے غنا
در مقامے قہر و در جائے رضا
در مقامے جور و در جائے وفا
در مقامے بخل و در جائے سخا
در مقامے دُرد و در جائے صفا
در مقامے خاک و جائے کیمیا
در مقامے عیب و در جائے ہنر
در مقامے سنگ و در جائے گہُر

۱- پیام ، ص ۲۳۴ ، ۲۳۵ -

در مقامے حنظل و جائے شکر
در مقامے خشکی و جائے مطر
در مقامے ظلم و جائے محضِ عدل
در مقامے جہل و جائے عینِ عقل
گرچہ ایں جا او گزند جاں بود
چوں بدانجا در رسد درماں بود
آب در غورہ ترش باشد ولیک
چوں بہ انگورے رسد شیرین و نیک
باز در خم ایں شود تلخ و حرام
در مقامِ سرکگی نعم الادام
ایں چنیں باشد تفاوت در امور
مردِ کامل ایں شناسد در ظہور[2]

حق تعالیٰ گرم و سرد و رنج و درد
بر تنِ ما می‌نہد اے شیر مرد
خوف و جوع و نقصِ اموال و بدن
جملہ بہرِ نقدِ جاں ظاہر شدن[3]

۲- مثنوی : ۱ ، ص ۵۲ ، س ۳۱ تا ۳۶ -
۳- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۴ ، س ۲۹ -

رنج و غم را حق پیِ آن آفرید
تا بدیں ضد خوش دلی آید پدید[۴]

آن بہاراں مضمر است اندر خزاں
در بہار است آن خزاں ، مگریز ازاں[۵]

قندِ شادی ، میوۂ باغِ غم است
ایں فرح زخم است و آں غم مرہم است[۶]

زندگی در مردن و در محنت است
آبِ حیواں در درونِ ظلمت است[۷]

توضیحات :

یہ مضمون فارسی اور اردو ادب اور صوفیانہ شاعری میں عام ہے ۔ اقبال کا یہ مصرع :

گفتش کہ سودِ خویش ز جیب زیاں برآر

عرفی شیرازی کے اس مصرعے کی یاد دلاتا ہے :

گوھر ہر سود در جیب زیاں انداختہ

۴۔ مثنوی : ۱ ، ص ۲۵ ، س ۲۳ ۔
۵۔ مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۳ ، س ۴۲ ۔
۶۔ مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۷ ، س ۲۲ ۔
۷۔ مثنوی : ۶ ، ص ۴۲۳ ، س ۳۹ ۔

اقبال کا مصرع :

خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

رومی کے شعر (۱۰) سے ہم آہنگ ہے ۔ اور یہ مصرع :

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی

غالب کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے :

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اور یہی مضمون غالب کے اس مصرعے میں ہے :

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

خود اقبال کا یہ مشہور شعر اس حقیقت کا بہترین ترجمان ہے :

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

☆ ☆ ☆

۵۷

زندگی ۔ غوغائے حیات ۔ تضرّع و زاری

اقبال

اے امینے از امانت بے خبر
غم مخور ، اندر ضمیرِ خود نگر

روزہا روشن ز غوغائے حیات
نے ازاں نورے کہ بینی در جہات

عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند
عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند

داغہا شوید ز دامانِ وجود
بے نگاہِ او جہاں کور و کبود

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سیّد جملہ موجودات را[1]

۱- جاوید ، ص ۹ ، ۱۰ -

رومی

رحمتم موقوفِ آں خوش گریہ ها ست
چوں گرست ، از بحرِ رحمت موج خاست
تا نہ گرید ابر ، کے خندد چمن
تا نہ گرید طفل ، کے جوشد لبن[۲]

اے برادر ! طفل ، طفلِ چشم تست
کامِ خود موقوفِ زاری داں نخست
کامِ تو موقوفِ زاریِ دل است
بے تضرع کامیابی مشکل است
گر همی‌خواهی کہ مشکل حل شود
خارِ محرومی بگل مبدل شود
گر همی خواهی کہ آں خلعت رسد
پس بگریاں طفلِ دیدہ بر جسد[۳]

روشنیِ خانہ باشی همچو شمع
گر فرو باری تو همچوں شمع دمع[۴]

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۸۵ ، س ۱۵ -
۳- مثنوی : ۲ ، ص ۸۶ ، س ۱۳ - ۱۵ -
۴- مثنوی : ۶ ، ص ۳۷۶ ، س ۸ -

بنده می‌نالد بحق از درد و نیش
صد شکایت می کند از رنج خویش

حق همی گوید که آخر رنج و درد
مر ترا لابه کنان و راست کرد

این گله زان نعمتے کن کت زند
از در ما دور و مطرودت کند

در حقیقت هر عدو داروے تست
کیمیاے نافع و دلجوے تست

تا ازو گردی گریزان در خلا
استعانت جوے از فضلِ خدا

در حقیقت دوستانت دشمنند
که ز حضرت دور و مشغولت کنند[5]

اشک کان از بهر او بارند خلق
گوهر است و اشک پندارند خلق[6]

از پیِ هر گریه آخر خنده ایست
مردِ آخر بین مبارک بنده ایست[7]

۵- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۷ ، س ۲۲ - ۲۳ -
۶- مثنوی : ۱ ، ص ۳۷ ، س ۱۷ -
۷- مثنوی : ۱ ، ص ۱۹ ، س ۲۴ -

چون جهنّم گریہ آرد یادِ آں
پس جہنّم خوشتر آمد از جناں

خندہ ها در گریہ ها آمد کتیم
گنج در ویرانہا جُو ، اے کلیم !

ذوق در غمہاست ، پے گم کردہ اند
آبِ حیواں را بظلمت بردہ اند[۸]

گریۂ با صدق با جاں ها زند
تاکہ عرش و فرش را نالاں کند

گریۂ بے صدق باشد بے فروغ
او نہ دارد چربیے مانندِ دوغ[۹]

گریہ ها و خندہ و شادیِ دل
هر یکے را معدنے داں مستقل

هر یکے را مخزن و مفتاحِ آں
اے برادر در کفِ فتّاح داں[۱۰]

چون خدا خواهد کہ ماں یاری کند
میلِ ما را جانبِ زاری کند

۸- مثنوی : ٦ ، ص ۳٤٦ ، س ۱۰ ، ۱۱ -
۹- مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۹ ، س ۹ ، ۱۰ -
۱۰- مثنوی ۵ ، ص ۳۴۵ ، س ۳٦ ، ۳٤ -

اے خنک چشمے کہ او گریان اوست
اے ہمایوں دل کہ او بریان اوست
کردہ ای بر دیگران نوحہ گری
مدتے بنشیں و بر خود میگری
ز ابرِ گریان شاخ سبز و تر شود
سوزِ شمع از گریہ روشن تر بود[11]

توضیحات :

اقبال نے کہا ہے :

عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند (۱)

اور یہ بھی کہا ہے :

داغہا شوید ز دامان وجود (۱)

''شوید'' (۱) لفظ بتا رہا ہے کہ ''گریۂ آدم'' (۲ تا ۱۱) پس منظر میں ہے جسے رومی نے اپنے اشعار میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اُس حکیمانہ پیغام کی بنیاد قرار دیا ہے جو اقبال اور رومی کے ہاں مشترک ہے۔ اقبال کے ہاں یہی چیز تسخیرِ کائنات اور جد و جہدِ حیات کے لیے ایک مستقل فلسفیانہ استدلال بن کر نمایاں ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

۱۱- مثنوی : ۱ ، ص ۱۹ ، س ۲۳ ، ۲۴ -

۵۸

زندگی ۔ لادینی تصوّرِ حیات ۔ زندگی کا مادی نقطۂ نظر

اقبال

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد
زیرِ گِردوں رسمِ لادینی نہاد
گُرگے اندر پوستینِ برّۂ
ہر زماں اندر کمینِ برّۂ
مشکلاتِ حضرتِ انساں ازوست
آدمیّت را غمِ پنہاں ازوست
در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است[1]

۱- پس ، ص ۲۵ -

رومی

این خریداران مفلس را بهل
چه خریداری کند یک مشت گل

گل مخر، گل را مخور، گل را مجو
زانکه گل خوار است دایم زرد رو

دل بجو تا دائماً باشی جوان
از تجلّی چهره ات چون ارغوان

طالبِ دل شو که تا باشی چو مُل
تا شوی شادان و خندان همچو گل[۲]

عقلِ جزوی آفتش وهم است و ظن
زانکه در ظلمات شد او را وطن[۳]

عقلِ جزوی عقل را بدنام کرد
کامِ دنیا مرد را بے کام کرد[۴]

خانهٔ آن دل که ماند بے ضیا
از شعاعِ آفتابِ کبریا

۲- مثنوی : ۲، ص ۱۱۶، س ۲۸، ۲۹ -
۳- مثنوی : ۳، ص ۱۶۲، س ۵ -
۴- مثنوی : ۵، ص ۲۸۶، س ۲۲ -

تنگ و تاریک است چون جانِ جهود

بے نوا از ذوقِ سلطانِ ودود

نے درآں دل تابِ نورِ آفتاب

نے کشادِ عرصہ و نے فتحِ باب[۵]

آدمی اوّل حریصِ ناں بود

زانکہ قوتِ ناں ستونِ جاں بود

سوی کسب و سوی غصب و صد حیل

جاں نہادہ بر کف از حرص و امل[۶]

آب و گل خواہد کہ در دریا رود

گل گرفتہ پائے او را میکشد

آں کشیدن چیست آں گل آب را

جذب تو نقل و شراب ناب را[۷]

مردِ دنیا مفلس است و ترس ناک

ہیچ او را نیست از دورانش باک

۵- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۷ ، س ۶ ، ۷-

۶- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۵ ، س ۱۱ -

۷- مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۳ ، س ۱۳ ، ۱۴ -

او برهنہ آمد و عریاں رود
وز غم و دردش جگر خوں میشود
وقت مرگش کہ بود صد نوحہ پیش
خندہ آید جانش را زیں ترس خویش
آں زماں داند غنی کش نیست زر
ہم ذکی داند کہ بود او بے ہنر[8]

آدمی را دشمن پنہاں بسے است
آدمئے با حذر عاقل کسے است[9]

ہست دنیا قہر خانۂ کردگار
قہر بیں چوں قہر کردی اختیار[10]

ظلم چہ بود ؟ وضع در ناموضعے
کہ نباشد جز بلا را منبعے[11]

۸- مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۹ ، س ۱ ، ۲ -
۹- مثنوی : ۱ ، ص ۲۳ ، س ۲۸ -
۱۰- مثنوی : ٦ ، ص ۳۸۰ ، س ۳۰ -
۱۱- مثنوی ۵ ، ص ۲۹۷ ، س ۲ -

اقبال

باطل از تعلیمِ او بالیدہ است
حیلہ اندوزی فنے گردیدہ است
شب بچشمِ اہلِ عالم چیدہ است
مصلحت تزویر را نامیدہ است[12]

رومی

فکرہا کردند آں دانا گروہ
کز زمیں بر کندہ شد زاں مکر کوہ
کردہ مکر و حیلہ آں قوم خبیث
ور زما باور نداری ایں حدیث
کرد وصف مکر ہا شاں ذوالجلال
لتزول منہ اقلال الجبال[13]

ہیں بخواں قرآں ، بیں سحرِ حلال
سر نگونی مکر ہائے کالجبال[14]

۱۲- رموز ، ص ۱۳۴ ، ۱۳۵ -
۱۳- مثنوی : ۱ ص ۲۲ ، س ۷ ، ۸ -
۱۴- مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۶ ، س ۱۳ -

توضیحات :

رومی نے ایسے لوگوں کو، جن کے نزدیک بقولِ اقبال انسان صرف ''آب و گل'' (۱) ہے، انسانیت کے ''خریدارانِ مفلس'' (۲) کہا ہے اور انسان کو متنبّہ کیا ہے کہ ایسے لوگوں کے ہاتھ نہ بک کہا جائے جو انسان کو ''مشتِ گل'' سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ رومی کی نصیحت ہے :

گل مخر، گل را مخور، گل را مجو
زانکہ گل خوار است دایم زرد رو

یہ الفاظ انسانی زندگی کے مادی نقطۂ نظر پر کتنی بھرپور تنقید ہیں۔ اس ذیل میں اقبال اور رومی کے دوسرے مندرجہ اشعار اسی بنیادی موضوع کے فروعی پہلو پیش کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

۵۹

زندگی ۔ تہذیبِ مغرب ۔ مادی نقطۂ نظر

اقبال

زورِ تن کاهید و خوفِ جاں فزود
خوفِ جاں سرمایۂ همّت ربود
صد مرض پیدا شد از بے همّتی
کوته دستی ، بے دلی ، دوں فطرتی
شیرِ بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ خویش را تهذیب گفت[1]

رومی

دامِ مکرِ او کمندِ شیر بود
طرفه خرگوشے که شیرے را ربود[2]

۱۔ اسرار ، ص ۲۹ تا ۳۱ ۔
۲۔ مثنوی : ۱ ، ص ۲۶ ، س ۲۴ ۔

کشتنِ ایں کارِ عقل و ہوش نیست

شیرِ باطن سخرۂ خرگوش نیست[۳]

توضیحات :

اقبال نے "شیر بیدار" (۱) کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ رومی کے شعر میں "شیر باطن" (۳) ہے ۔ اقبال نے جس مفہوم کو "خونِ میش" (۱) کے استعارے سے ادا کیا ہے ، رومی کے بیان میں اسی مفہوم کے لیے "مکر خرگوش" (۲) کا ذکر آیا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۳۔ مثنوی : ۱ ، ص ۳۰ ، س ۷ ۔

۶۰

زندگی ۔ نصب العین اور زندگی

اقبال

زندگانی را بقا از مدّعاست
کاروانش را درا از مدّعاست

زندگی در جستجو پوشیده است
اصلِ او در آرزو پوشیده است

آرزو صیدِ مقاصد را کمند
دفترِ افعال را شیرازہ بند[1]

رومی

جاں بدہ از بہرِ انجام ، اے پسر!
بے جہاد و صبر کے باشد مفر

۱- اسرار ، ص ۱۶ -

صبر کردن بہرِ ایں نبود حرج
صبر کن کالصبر مفتاح الفرج[۲]

دست کے جنبد بایثار و عمل
تا نہ بیند دادہ را جانش بدل
آنکہ بدہد بے امیدِ سودہا
آں خدایست ، آں خدایست آں خدا[۳]

یک سلامے نشنوی ، اے مردِ دیں
کہ نگیرد آخرت آں آستیں
بے طمع نشنیدہ ام از خاص و عام
من سلامے ، اے برادر! والسلام[۴]

قصد گنجے کن کہ ایں سود و زیاں
در تبع آید ، تو آنرا فرع داں
ہر کہ کارد ، قصدِ گندم بایدش
کاہ خود اندر تبع می آیدش

۲- مثنوی : ۳ ، ص ۱۴۱ ، س ۱۵ -
۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۱ ، س ۱۲ -
۴- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۱ ، س ۱۵ ، ۱۶ -

قصد کعبہ کن چو وقت حج بود
چونکہ رفتی مکہ ہم دیدہ شود
قصد در معراج دید دوست بود
در تبع عرش و ملایک ہم نمود۵

پادشاہے را خدا کشتی کند
تا بحرص خویش بر صفہا زند
قصد شاہ آں نے کہ خلق ایمن شوند
قصدش آنکہ ملک گردد بے گزند
آں خراسے می دود ، قصدش خلاص
تا بیابد از خشب یکدم مناص
قصد او آں نے کہ آبے بر کشد
یا کہ کنجد را بداں روغن کند
گاو بشتابد ز بیم زخم سخت
نے برائے بردن گردون و رخت
لیک حق دادش چنیں خوف وجع
تا مصالح حاصل آید در تبع
ہمچنیں ہر کاسبے اندر دکاں
بہر خود کوشد ، نہ اصلاح جہاں

۵- مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۳ ، س ۱۵ تا ۱۷-

هر یکے بر درد جوید مرهمے
در تبع قائم شده زان عالمے
حق ستون این جهان از ترس ساخت
هر یکے از ترس جان در کار تاخت[۶]

یوسف حسنی تو ، این عالم چو چاه
وین رسن صبر است از امرِ الله
یوسفا آمد رسن ، برزن تو دست
از رسن غافل مشو ، بیگه شده ست
حمد لله کاین رسن آویختند
فضل و رحمت را بهم آمیختند
در رسن زن دست و بیرون رو ز چاه
تا به بینی بارگاهِ پادشاه
تا به بینی عالمِ جانِ جدید
عالمے بس آشکار و ناپدید[۷]

آدمی را هست در هر کار دست
لیک ازو مقصود این خدمت بده ست

۶- مثنوی : ۶ ، ص ۳۸۵ ، س ۹ تا ۱۳ -
۷- مثنوی : ۲ ، ص ۹۸ ، س ۳۳ ، ۳۴ -

ما خلقت الجنّ والانس این بخوان
جز عبادت نیست مقصود از جہان[۸]

از خدا غیرِ خدا را خواستن
ظنِ افزونیست ، کلّی کاستن[۹]

منگر این را کہ حقیری یا ضعیف
بنگر اندر همّتِ خود ، اے شریف
تو بہر حالے کہ باشی ، می طلب
آب میجو دایما ، اے خشک لب
کاں لبِ خشکت گواهی میدهد
کہ بآخر بر سر منبع رود
خشکیِ لب هست پیغامے ز آب
کہ بمات آرد یقیں ایں اضطراب
کایں طلبگاری مبارک جنبشے است
ایں طلب در راہِ حق مانع کشے است[۱۰]

۸- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۵ ، س ۵ ، ٦ -
۹- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۱ ، س ۲۹ -
۱۰- مثنوی : ۳ ، ص ۱۵۹ ، س ۴۲ ، ۴۴ -

چون نہادی در طلب پا اے پسر
یافتی و شد میسّر بے خطر

هین مباش اے خواجہ یکدم بے طلب
تا بیابی هر چہ خواهی ، اے عجب

عاقبت جوینده یابنده بود
چونکہ در خدمت شتابنده بود[11]

گفت پیغمبر کہ چون کوبی درے
عاقبت زان در برون آید سرے

چون نشینی بر سر کوے کسے
عاقبت بینی تو هم روے کسے

چون ز چاهے میکنی هر روز خاک
عاقبت اندر رسی در آبِ پاک[12]

سایۂ حق بر سرِ بنده بود
عاقبت جوینده ، یابنده بود[13]

۱۱- مثنوی : ۳ ، ص ۱٦۰ ، س ۱ -
۱۲- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۴ ، س ١۷ ، ۱۸ -
۱۳- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۴ ، س ۱۷ -

تشنگاں گر آب جویند از جہاں

آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

گر مرادت را مذاقِ شکّر است

بے‌مرادی نے مرادِ دلبر است[14]

ایں طلب مفتاحِ مطلوباتِ تست

ایں سپاہِ نصرت و رایاتِ تست[15]

گرچہ آلت نیستت تو می طلب

نیست آلت حاجت اندر راہِ رب[16]

آب کم جو ، تشنگی آور بدست

تا بجوشد آبت از بالا و پست

تا سقاھم ربّہم آید خطاب

تشنہ باش ، اللہ اعلم بالصواب[17]

۱۴- مثنوی : ۱ ، ص ۳٦ ، س ۲۹ ، ۳۳ -

۱۵- مثنوی : ۳ ، ص ۱٦۰ ، س ۱ -

۱٦- مثنوی : ۳ ، ص ۱٦۰ ، س ۲ -

۱۷- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۹ ، س ۵ ، ۹ -

هیچ مستسقی بنگریزد ز آب
گر دو صد بارش کند مات و خراب[۱۸]

جذب آبست این عطش در جان ما
ما از آنِ او و او هم آنِ ما[۱۹]

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست
با کریماں کارها دشوار نیست[۲۰]

کوے نومیدی مرو ، امیدهاست
سوے تاریکی مرو ، خورشیدهاست[۲۱]

نے مشو نومید ، خود را شاد کن
پیشِ آن فریاد رس فریاد کن[۲۲]

انبیا گفتند نومیدی بد است
فضل و رحمتہاے آن رب بیحد است

۱۸- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۹ ، س ۲۹ -
۱۹- مثنوی : ۳ ، ص ۲۰۸ ، س ۱۳ -
۲۰- مثنوی : ۱ ، ص ۷ ، س ۵ -
۲۱- مثنوی : ۱ ، ص ۱۷ ، س ۱۰ -
۲۲- مثنوی : ۱ ، ص ٦۵ ، س ۲۰ -

از چنیں محسن نشاید نا امید
دست در فتراک ایں رحمت زنید
بعدِ نومیدی بسے امیدہاست
از پسِ ظلمت بسے خورشیدہاست[۲۳]

لیک خورشید عنایت تافتہ است
آیساں را از کرم دریافتہ است
نرد بس نادر ز رحمت باختہ
عینِ کفراں را انابت ساختہ[۲۴]

توضیحات :

رومی نے زندگی کے مقصود اور نصب العین کی طرف الفاظ ''انجام'' (۲) ، ''مقصود'' (۸) اور ''مراد'' (۱۴) کے ذریعے متوجہ کیا ہے اور اس نصب العین کی طرف بڑھنے کے لیے الفاظ ''قصد'' (۵) ، ''درد'' (۶) ، ''طلب گاری'' (۱۰) ، ''طلب'' (۱۰ ، ۱۱ ، ۱۶) ، ''کوبی درے'' (۱۲) ، ''تشنگی'' (۱۷) ''عطش'' (۱۹) وغیرہ استعمال کیے ہیں اور اقبال نے الفاظ ''مدعا'' ، ''جستجو'' اور ''آرزو'' (۱) -

☆ ☆ ☆

۲۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۴ ، س ۴ ، ۵ -

۲۴- مثنوی : ۶ ، ص ۳۸۶ ، س ۱۳ ، ۱۴ -

٦١

عشق ـ بصیرتِ عشق ـ جذبِ عشق

اقبال

از شعور است این که گوئی نزد و دور
چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
وا رهاند جذب و شوق از تحت و فوق[1]

رومی

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت
هرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغِ 'لا' در قتلِ غیرِ حق براند
در نگر زاں پس کہ بعد از 'لا' چہ ماند

۱ـ جاوید ، ص ۲۰ ـ

ماند "الا" الله" ، باقی جملہ رفت

شاد باش اے عشقِ شرکت سوزِ زفت[2]

عقل را قرباں کن اندر عشقِ دوست

عقل‌ها بارے ازاں سویست کوست

عقل‌ها آں سو فرستادہ عقول

ماند آں سو کہ نہ معشوق است گول[3]

ایں جہانِ منتظم محشر شود

گر دو دیدہ مبدل و انور شود[4]

ہر دمے او را یکے معراجِ خاص

بر سر فرقش نہد حق تاجِ خاص

صورتش بر خاک و جاں در لا مکاں

لامکانے فوقِ وہمِ سالکاں

لامکانے نے کہ در وہم آیدت

ہر دمے در وے خیالے زایدت

۲- مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۸ ، س ۲۴ ، ۲۵ -

۳- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۸ ، س ۳۰ ، ۳۱ -

۴- مثنوی : ۶ ، ص ۳۶۵ ، س ۹ -

بل مکان و لامکان در حکمِ او
همچو در حکمِ بہشتے چار جو[5]

جان شناسان از عددها فارغ اند
غرقهٔ دریاے بیچون اند و چند
جان شو و از راهِ جان جان را شناس
یارِ بینش شو ، نه فرزندِ قیاس[6]

دامنِ او گیر ، اے یارِ دلیر
کو منزّه باشد از بالا و زیر
با تو باشد در مکان و لامکان
تا تو باشی ، او نباشد درمیان[7]

توضیحات :

اقبال نے ''تحت و فوق'' (۱) کے الفاظ استعمال کیے ہیں - رومی کے اشعار میں ہے ''بالا و زیر'' (۷) - اس سے بڑھ کر یہ کہ رومی نے عشق کے پیدا کردہ شعور کے بیان کے لیے لفظ ''معراجِ خاص'' (۵)

۵- مثنوی : ۱ ، ص ۴۴ ، س ۴ تا ۶ -
۶- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۸ ، س ۳۰ ، ۳۱ -
۷- مثنوی : ۳ ، ص ۱۴۳ ، س ۷ ، ۸ -

استعمال کیا تھا ۔ اقبال نے بھی کہا ہے ''چیست معراج'' ۔ اس ضمن میں اقبال نے ''انقلاب اندر شعور'' (۱) کی طرف متوجہ کیا ہے۔ رومی نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا :

گر دو دیدہ مبدل و انور شود (۲)

☆ ☆ ☆

۶۲

عشق - تسخیرِ عقل و ادراک

اقبال

چہ پرسی از طریقِ جستجویش
فرود آ در مقامِ های و ہویش
شب و روزے کہ داری بر ابد زن
فغانِ صبح گاهی بر خرد زن
خرد را از حواس آید متاعے
فغاں از عشق می‌گیرد شعاعے
خرد جز را ، فغاں کل را بگیرد
خرد میرد ، فغاں هرگز نمیرد
خرد بہرِ ابد ظرفے ندارد
نفس چوں سوزنِ ساعت شمارد

ترا شد روز ها ، شب ها ، سحر ها

نگیرد شعلہ و چیند شرر ها[1]

رومی

عاشقی پیداست از زاریِ دل

نیست بیماری ، چو بیماریِ دل

ملّتِ عاشق ز ملّت ها جداست

عشق اصطرلابِ اسرارِ خداست[2]

گفت آں اللہِ تو لبیکِ ماست

ایں نیاز و سوز و دردت پیکِ ماست[3]

بے غرض نبود بگردش در جہاں

غیرِ جسم و غیرِ جانِ عاشقاں

عاشقانِ کل ، نہ ایں عشّاقِ جزو

ماند از کل ہرکہ شد مشتاقِ جزو[4]

۱- زبور ، ص ۲۲۹ -

۲- مثنوی : ۱ ، ص ۳ ، س ۲۹ -

۳- مثنوی : ص ، س -

۴- مثنوی : ۱ ، ص ۵٦ ، س ۲۸ ، ۳۲ -

عاشقم من بر فنِ دیوانگی
سیرم از فرهنگ و از فرزانگی[5]

هین منه بر پایم این زنجیر را
که دریدم سلسله تدبیر را
غیرِ آن زنجیرِ زلفِ دلبرم
گر دو صد زنجیر آری ، بر درم[6]

عقلِ جزوی عشق را منکر بود
گرچه بنماید که صاحب سر بود
زیرک و داناست امّا نیست نیست
تا فرشته لا نشد ، اهریمنی ست[7]

زین خرد جاهل همی باید شدن
دست در دیوانگی باید زدن
آزمودم عقلِ دور اندیش را
بعد ازین دیوانه سازم خویش را[8]

۵- مثنوی : ۶ ، ص ۳۶۱ ، س ۸ -
۶- مثنوی : ۶ ، ص ۳۶۱ ، س ۳۰ ، ۳۱ -
۷- مثنوی : ۱ ، ص ۱۳ ، س ۶ ، ۷ -
۸- مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۳ ، س ۳۲ ، ۳۳ -

عقلِ جزوی آفتش وهم است و ظن

زانکه در ظلمات شد او را وطن[9]

عقلِ جزوی را وزیر خود مگیر

عقلِ کل را ساز، اے سلطان، وزیر[10]

جملہ تلوین ها ز ساعت خاستست

رست از تلوین کہ از ساعت برست

چون ز ساعت ساعتے بیرون شوی

چون نمانی، محرمِ بےچون شوی

ساعت از بیساعتی آگاه نیست

زانکہ آنسو جز تحیّر راه نیست[11]

کرده ای بر دیگران نوحہ گری

مدتے بنشین و بر خود میگری

زابرِ گریان شاخ سبز و تر شود

نورِ شمع از گریہ روشن تر بود[12]

۹- مثنوی : ۳، ص ۱۶۲، س ۵ -

۱۰- مثنوی : ۴، ص ۲۳۶، س ۹ -

۱۱- مثنوی : ۳، ص ۱۷۰، س ۲۳ تا ۲۵ -

۱۲- مثنوی : ۲، ص ۸۶، س ۳۶، ۳۷ -

توضیحات :

اقبال نے عقل کو تسخیر کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے اس میں ''جستجو''، ''ھای و ھُو'' اور ''فغانِ صبحگاھی'' (۱) کا ذکر ہے۔ رومی نے اسی مفہوم کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں : ''زاریِ دل'' (۲) ''نیاز و سوز و درد'' (۳) ''گریہ'' (۱۲) ۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر اقبال نے ''جزو'' اور ''کل'' (۱) کے حوالے سے بات کی ہے ۔ یہی الفاظ رومی کے اشعار (۴ ، ۷ ، ۹ ، ۱۰) میں آئے ہیں ۔

۶۳
عشق ـ عشق و دانش و دین

اقبال

عشق هم خاکستر و هم اخگر است
کارِ او از دین و دانش برتر است
عشق سلطان است و برهانِ مبین
هر دو عالم عشق را زیرِ نگین
چون خودی را از خدا طالب شود
جمله عالم مرکب ، او راکبِ شود[1]

رومی

داند آن کو نیک بخت و محرم است
زیرکی زابلیس و عشق از آدم[2] است

۱- جاوید ، ص ۱۸ -

زیرکی سبّاحی آمد در بحار
کم رهد، غرق است او پایانِ کار

عشق چون کشتی بود بهرِ غواص
کم بود آفت، بود اغلب خلاص

زیرکی بفروش و حیرانی بخر
زیرکی ظنّست و حیرانی نظر

عقل را قربان کن اندر عشقِ دوست
عقل ها بارے ازاں سویست کوست

عقل ها آنسو فرستاده عقول
ماند آنسو که نه معشوق است گول[۲]

سخت تر شد بندِ من از پندِ تو
عشق را نشناخت دانشمندِ تو

آنطرف که عشق می افزود درد
بوحنیفه و شافعی درسے نکرد[۳]

عاشقاں را کار نبود باوجود
عاشقاں را هست بے سرمایه سود

۲- مثنوی : ۴، ص ۲۳۸، س ۱۹، ۲۱، ۳۰، ۳۱ -

۳- مثنوی : ۳، ص ۱۹۸، س ۳۴، ۳۵ -

بال نے و گردِ عالم می پرند
دست نے وگوز میداں می برند
عاشقاں اندر عدم خیمہ زدند
چوں عدم یکرنگ و نفسِ واحد اند[۴]

خوشتر از ہر دو جہاں آنجا بود
کہ مرا با تو سر و سودا بود[۵]

با دو عالم عشق را بیگانگی
وندر آں ہفتاد و دو دیوانگی
سخت پنہان است و پیدا حیرتش
جانِ سلطانانِ جاں در حسرتش
غیرِ ہفتاد و دو ملّت کیش او
تختِ شاہاں تختہ بندے پیشِ او[۶]

ملّتِ عشق از ہمہ دینہا جداست
عاشقاں را مذہب و ملّت خداست[۷]

۴- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۵ ، س ۲۷ - ۲۹ -
۵- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۸ ، س ۲۰ -
۶- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۳ ، س ۲۲ ، ۲۳ -
۷- مثنوی ، ۲ ، ص ۱۰۶ ، س ۲۱ -

زانکہ عاشق در دمِ نقد است مست
لاجرم از کفر و ایماں برتر است
کفر و ایماں ہر دو خود دربانِ اوست
کوست مغز و کفر و دیں اورا دو پوست[۸]

توضیحات :

عشق کے بارے میں اقبال کا مصرع :

کار او از دین و دانش برتر است (۱)

رومی کے اس مصرع :

لاجرم از کفر و ایماں برتر است (۸)

سے فکر اور بیان میں کس قدر نزدیک ہے ۔ اسی طرح اقبال کے اس شعر میں :

عشق سلطان است و برہان مبیں
ہر دو عالم عشق را زیرنگیں (۱)

رومی کی یہ آواز :

تخت شاہاں تختہ بندے پیش او (٦)

صاف سنائی دیتی ہے ۔ اقبال کا قول :

کارِ او از دینؔ و دانش برتر است

رومی کے ان اقوال کا ترجمان ہے :

غیر ہفتاد و دو ملّت کیش او (٦)

ملّتِ عشق از ہمہ دینہا جداست

۸۔ مثنوی : ۳ ، ص ۲٦۸ ، س ۲۸ ، ۲۹ ۔

رومی کے یہ اشعار :

عاشقاں را کار نبود باوجود
عاشقاں را ہست بے سرمایہ سود
بال نے و گردِ عالم می پرند
دست نے و گو ز میداں می برند (۴)

اقبال کے اس ایک شعر میں :

عشق سلطان است و برہان مبین
ہر دو عالم عشق را زیر نگیں (۱)

سمٹ آئے ہیں ۔

☆ ☆ ☆

۶۴

عشق ـ سلطانیِ عشق

اقبال

باز گفتم پیشِ حق رفتن چسان
کوہِ خاک و آب را گفتن چسان

گفت اگر سلطان ترا آید بدست
می توان افلاک را از هم شکست[۱]

رومی

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جان طور آمد عاشقا
طور مست و خرّ موسیٰ صعقا[۲]

۱- جاوید ، ص ۱۵ -
۲- مثنوی : ۱ ، ص ۲ ، س ۱۷ -

عشق جوشد بحر را مانندِ دیگ
عشق ساید کوہ را مانند ریگ
عشق بشگافد فلک را صد شگاف
عشق لرزاند زمیں را از گزاف[۳]

کہ پری و آدمی زندانی اند
ہر دو در زندان ایں نادانی اند
معشر الجن ، سورۂ رحمٰن بخوان
تستطیعوا تنفذوا را باز دان[۴]

لیس للجنِّ ولا للانسِ ان
تنفذوا من حبس اقطار الزمن
لا نفوذ الاّ بسلطان الہدیٰ
من تجاویفِ السمٰوات العلیٰ[۵]

در نُبی ان استطعتم تنفذوا
ایں سخن با جنّ و انس آمد ز ہو[۶]

۳- مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۵ ، س ۲٦ ، ۲۷ -
۴- مثنوی : ۱ ، ص ۳۰ ، س ۱ -
۵- مثنوی : ٦ ، ص ۳۵۵ ، س ۲۰ -
٦- مثنوی : ٦ ، ص ۴۰۹ ، س ۳ -

توضیحات :

اقبال نے عشق کے ذریعے عالمِ مادی کی تسخیر کا بیان کوہ طور کی تلمیح لا کر کیا ہے ، اسی طرح جیسے رومی نے ۔ اقبال نے کہا ہے :

کوہ خاک و آب را گفتن چساں (۱)

رومی نے کہا تھا :

کوہ در رقص آمد و چالاک شد (۲)

نیز :

عشق ساید کوہ را مانندِ ریگ (۳)

اقبال نے عالمِ مادی کو ''کوہِ خاک و آب'' (۱) سے تعبیر کیا ہے جسے عشق کی قوتِ تسخیر پامال کر دیتی ہے ۔ رومی نے اپنی علامتیں انھی دو عناصر سے لی ہیں ؛ یعنی ''بحر'' اور ''کوہ'' اور عشق کی قوتِ تسخیر کو یوں بیان کیا ہے :

عشق جوشد بحر را مانندِ دیگ
عشق ساید کوہ را مانندِ ریگ (۴)

رومی نے ''سلطانیِ عشق'' کے بیان میں سورۂ مبارکہ ''رحمٰن'' کی تینتیسویں آیت کو اپنے اشعار (۴ ، ۵ ، ۶) کی بنیاد بنایا ہے ۔ اس آیۂ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ ''اے گروہِ جنّ وانس ! تم اقطارِ سمٰوات و ارض سے نکلنے کا یارا رکھتے ہو تو نکل کر دیکھو ۔ تم ہرگز نہیں نکل سکتے ، اس قوت کے بغیر جو سلطانی قوت ہے ۔'' اقبال

نے بھی اپنے اس شعر :

گفت اگر سلطان ترا آید بدست
می‌توان افلاک را از هم شکست (۱)

میں اسی آیت سے استفادہ کیا ہے اور عشق کو 'سلطان' کہا ہے۔ اسی طرح جیسے رومی نے اپنے شعر(۵) میں عشق کو ''سلطانِ ہدایت'' قرار دیا ہے۔

۶۵

عشق ـ عشق اور حیات و کائنات

اقبال

بہ برگِ لالہ رنگ آمیزیِ عشق
بجانِ ما بلا انگیزیِ عشق
اگر این خاک دان را واشگافی
درونش بنگری خونریزیِ عشق[1]

رومی

از محبّت تلخ ها شیرین شود
وز محبّت مس ها زرین شود
از محبّت دُردها صافی شود
وز محبّت دردها شافی شود

۱- پیام ، ص ۱۳ -

از محبت خـار ها گل می شود
وز محبت سرکہ ها مُل می شود
از محبت دار تختے میشود
وز محبت بـار بختے میشود
از محبت سجن گلشن میشود
بے محبت روضہ گلخن میشود
از محبت نـار نـورے میشود
وز محبت دیـو حـورے میشود
از محبت سنگ روغن میشود
بے محبت موم آهن میشود
از محبت حزن شادی میشود
وز محبت غول هـادی میشود
از محبت نیش نوشے میشود
وز محبت شیر موشے میشود
از محبت سقم صحّت میشود
وز محبت قهـر رحمت میشود
از محبت مرده زنـده می شود
وز محبت شـاه بنـده می شود
این محبت ، هم نتیجۂ دانش است
کے گزافہ بر چنیں تختے نشست

دانشِ ناقص کجا این عشق زاد
عشق زاید نقص امّا بر جماد[2]

عاشقی پیداست از زاریِ دل
نیست بیماری ، چو بیماریِ دل
علّتِ عاشق ز علّتها جداست
عشق اصطرلابِ اسرارِ خداست[3]

عشق از اوّل چرا خونی بود
تا گریزد هرکہ بیرونی بود[4]

جرعۂ خون ریخت ساقیِ الست
بر سرِ این خاک ، شد هر ذره مست
جوش کرد آن خاک،ما زان جوششیم
جرعۂ دیگر کہ ما بےکوششیم ![5]

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۲ ، س ۲۶ — ۳۲ -
۳- مثنوی : ۱ ، ص ۴ ، س ۲۹ -
۴- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۳ ، س ۳۹ -
۵- مثنوی : ۵ ، ص ۸۵ ، س ۱۶ ، ۱۷ -

توضیحات :

اقبال نے عشق کی ''بلا انگیزی" (۱) اور ''رنگ آمیزی" (۱) "لالہ'' (۱) کی مثال دے کر اپنے اجمالی اسلوب میں بیان کی ہے۔ رومی نے اس حقیقت کو اپنے اشعار میں متعدد مثالیں دے کر واضح کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

٦٦

عشق - عظمت و رفعتِ عشق

اقبال

کوہ پیشِ عشق چوں کاھے بود
دل سریع السیر چوں ماھے بود
عشق شبخونے زدن بر لامکاں
گور را نادیدہ رفتن از جہاں[1]

رومی

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا
طور مست و خرّ موسیٰ صعقا[2]

۱- جاوید : ص ۱۷ -
۲- مثنوی : ۱ ، ص ۲ ، س ۱۷ -

گر نبودے بہرِ عشقِ پاک را
کے وجودے دادمے افلاک را
من بداں افراشتم چرخِ سنی
تا علوِ عشق را فہمے کنی[۳]

توضیحات:

اقبال کا مصرع:

کوہ پیش عشق چوں کاہے بود (۱)

رومی کے مصرعے:

کوہ در رقص آمد و چالاک شد

کے ساتھ مفہوم اور تلمیح دونوں میں متوازی ہے۔ اسی طرح اقبال کا یہ مصرع:

عشق شبخونے زدن بر لامکاں

رومی کے مصرعے:

جسم خاک از عشق بر افلاک شد

کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس مقام پر اقبال اور رومی دونوں کی فکر رفعت و عظمتِ عشق کے بیان میں معراج نبوی کے پرتو سے مستنیر ہے۔ رومی کے مندرجہ بالا اشعار میں جو دوسری تلمیحات ہیں ان کی توضیح کرنا یہاں ہمارا مقصود نہیں۔

☆ ☆ ☆

۳۔ مثنوی: ۵، ص ۳۲۵، س ۲۸، ۲۹۔

٦٧

عشق ۔ عقل و دل

اقبال

تہی از ہای و ھُو میخانہ بودے
گلِ ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق و ایں ہنگامۂ عشق
اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے[1]

رومی

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا
طور مست و خرّ موسیٰ صعقا[2]

۱- پیام ، ص ۲ -
۲- مثنوی : ۱ ، ص ۲ ، س ۱۷ -

زیں خرد جاہل ہمی باید شدن
دست در دیوانگی باید زدن
آزمودم عقلِ دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را[3]

توضیحات :

اقبال نے کہا ہے ''کلِ ما'' (۱) - رومی کے کلام میں اسی مفہوم کے لیے ہے ''جسمِ خاک'' (۲) - اقبال نے ان اشعار میں بتایا ہے کہ عشق نہ ہوتا تو انسان اور کائنات کا کیا عالم ہوتا (۱)- رومی نے یہاں مثبت انداز میں فتوحاتِ عشق کا بیان کیا ہے - اقبال نے عشق کی پیدا کردہ ارتقائی حرکت کو انسان کے پیکرِ خاکی میں ''شرر'' سے تعبیر کیا ہے - رومی نے عشق کی یہ حرکی کیفیت ''بر افلاک شد''(۲) ''در رقص آمد و چالاک شد'' (۲) کہہ کر واضح کی ہے -

☆ ☆ ☆

۳- مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۴ ، س ۳۲ ، ۳۴ -

۶۸

عشق - عقل و عشق کے حدودِ کار

اقبال

عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند
عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند
داغ ہا شوید ز دامانِ وجود
بے نگاہِ او جہاں کور و کبود
ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سیّد جملہ موجودات را[1]

رومی

پیش بینیِ خرد تا گور بود
وانِ صاحبدل بہ نفخِ صور بود

۱- جاوید، ص ۹، ۱۰ -

این خرد از خاکِ گورے نگذرد
وین قدم عرصهٔ عجائب نسپرد[۲]

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوه در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا
طور مست و خرّ موسیٰ صعقا[۳]

عشق جوشد بحر را مانند دیگ
عشق ساید کوه را مانندِ ریگ
عشق بشگافد فلک را صد شگاف
عشق لرزاند زمیں را از گزاف[۴]

چرخ را در زیر پا آر اے شجاع
بشنو از فوقِ فلک بانگِ سماع[۵]

توضیحات :

عقل کی کارپردازی کو اقبال نے عالمِ آب و گل پر دام افگنی

۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۶۹ ، س ۸ ، ۹ -
۳- مثنوی : ۱ ، ص ۲ ، س ۱۷ -
۴- مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۵ ، س ۲۶ ، ۲۷ -
۵- مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۸ ، س ۱۴ -

تک محدود قرار دیا ہے ۔ اس محدودیت کو ظاہر کرنے کے لیے ''تاگور'' اور ''خاک گور'' (۲) الفاظ استعمال کیے ہیں جو وہی مفہوم ادا کرتے ہیں ۔ عشق کی لامحدود فعالیت کو اقبال نے ''شبخوں بر لا مکاں'' (۱) اور رومی نے ''فوقِ فلک'' (۵) الفاظ سے واضح کیا ہے ۔ نیز ملاحظہ ہو عنوان ''عظمتِ عشق'' ۔

۶۹

آئینِ عقل و آئینِ عشق

اقبال

عقل هم خود را بدیں عالم زند
تا طلسمِ آب و گل را بشکند
می شود هر سنگِ ره او را ادیب
می شود برق و سحاب او را خطیب
چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست
لیکن او را جرأتِ رندانہ نیست
پس ز ترسِ راہ چوں کورے رود
نرم نرمک صورتِ مورے رود
کارش از تدریج می یابد نظام
من نہ دانم کے شود کارش تمام
می نداند عشق سال و ماه را
دیر و زود و نزد و دورِ راه را

عقل در کوهے شگافے می کند
یا بگردِ او طوافے می کند
کوه پیشِ عشق چوں کاھے بود
دل سریع‌السیر چوں ماھے بود[1]

رومی

پاے استدلالیاں چوبیں بود
پاے چوبیں سخت بے تمکیں بود[2]

علم دریائیست بے‌حد و کنار
طالبِ علم است غواصِ بحار
گر هزاراں سال باشد عمرِ او
می نگردد سیر او از جستجو[3]

عشق جوشد بحر را مانندِ دیگ
عشق ساید کوه را مانندِ ریگ
عشق بشگافد فلک را صد شگاف
عشق لرزاند زمیں را از گزاف[4]

۱- جاوید، ص ۱۷ -
۲- مثنوی : ۱، ص ۴۴، س ٦ -
۳- مثنوی : ٦، ص ۳۰۹، س ۱۹، ۲۰ -
۴- مثنوی : ۵، ص ۳۲۵، س ۲٦، ۲۷ -

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوه در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا
طور مست و خرّ موسیٰ صعقا[5]

عاشقاں را کار نبود با وجود
عاشقاں را هست بے سرمایہ سود
بال نے و گردِ عالم می پرند
دست نے و گو ز میداں می برند[6]

توضیحات :

رومی نے عقل کی آہستہ روی ، تدریجی رسائی اور زمان و مکاں سے رشتہ بپا ہونے کا تصوّر ان الفاظ میں دیا ہے :

پای چوبیں سخت بے تمکیں بود (۲)

نیز :

گر ہزاراں سال باشد عمر او
می نگردد سیر او از جستجو (۳)

اس کے مقابل عشق کی فی‌الفور اور وسائط کے بغیر رسائی کا تصوّر دینے

۵- مثنوی : ۱ ، ص ۲ ، س ۱۷ -
۶- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۵ ، س ۲۷ ، ۲۸ -

کے لیے کہا ہے :

عشق جوشد بحر را مانندِ دیگ
عشق ساید کوہ را مانندِ ریگ
عشق بشگافد فلک را صد شگاف
عشق لرزاند زمیں را از گزاف (۴)

اقبال نے عقل کی سست گامی کو یوں بیان کیا ہے :

پس ز ترسِ راہ چوں کورے رود
نرم نرمک صورتِ مورے رود (۱)

اور عشق کی فعالیت کو ، جسے رومی نے اپنے مذکورہ شعر (۴) میں نمایاں کیا ہے ، واضح کرنے کے لیے ایک لفظی ترکیب ''جرأتِ رندانہ'' (۱) ایسی استعمال کی ہے کہ رومی کے چاروں مصرعوں کی روح ان دو لفظوں میں سما گئی ہے ۔

☆ ☆ ☆

۷۰

عشق ۔ عقل و عشق ۔ علومِ عصرِ حاضر

اقبال

نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس

بیا کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد[1]

دانشِ حاضر حجابِ اکبر است

بت پرست و بت فروش و بت گر است[2]

عصرِ حاضر را خرد زنجیرِ پاست

جانِ بے تابے کہ من دارم کجاست[3]

۱۔ پیام ، ص ۱۹۳ ۔
۲۔ اسرار ، ص ۷۷ ۔
۳۔ جاوید ، ص ۳ ۔

بچشمِ عشق نگر تا سراغِ او گیری
جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است[۴]

رومی

خود خرد آنست کو از حق چرید
نے خرد کانرا عطارد آورید
پیش بینیِ خرد تا گور بود
وانِ صاحبدل بنفخِ صور بود
این خرد از خاکِ گورے نگذرد
وین قدم عرصۂ عجائب نسپرد
زین قدم وین عقل رو بیزار شو
چشمِ غیبی جوی و برخوردار شو
زین نظر وین عقل ناید جز دوار
پس نظر بگذار و بگزین انتظار
از سخن گوئی بجوئید ارتفاع
منتظر را بہ ز گفتن استماع[۵]

از حطب بشناس شاخ سدره را
گرچہ ہر دو سبز باشند اے فتیٰ

۴- پیام ، ص ۱۷۸ -
۵- مثنوی : ۴ ، ص ۲۶۹ ، س ۸ تا ۱۱ -

اصلِ آں شاخست هفتم آسماں
اصلِ ایں شاخست از نار و دخاں
هست مانند آں بصورت پیش حس
که غلط بینست چشم و کیش حس
هست آں پیدا به پیش چشم دل
جهد کن سوے دل آ جهد المقل
ور نداری پا ، بجنباں خویش را
تا ببینی هر کم و هر بیش را[6]

اقبال

مرید :
چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں
پیر رومی :
علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود[7]

رومی

علمهاے اهلِ دل حمّال شاں
علمهاے اهلِ تن احمال شاں
علم چوں بر دل زند یارے شود
علم چوں بر تن زند بارے شود[8]

۶- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۷ ، س ۶ - ۸ -
۷- بال ، ص ۱۸۰ -
۸- مثنوی : ۱ ، ص ۶۸ ، س ۱۲ ، ۱۳ -

اقبال

عصرِ حاضر را خرد زنجیرِ پاست
جانِ بے تابے کہ من دارم، کجا ست[9]

بچشمِ عشق نگر تا سراغِ او گیری
جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است[10]

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا[11]

رومی

صد ہزاراں فضل دارد از علوم
جان خود را می‌نداند ایں ظلوم
داند او خاصیّتِ ہر جوہرے
در بیانِ جوہرِ خود چوں خرے
کہ ہمی دانم یجوز و لایجوز
ایں ندانی تو کہ حوری یا عجوز
ایں روا و ناروا دانی، ولیک
خود روا یا ناروائی بیں تو نیکہ

۹- جاوید، ص ۳ -
۱۰- پیام، ص ۱۲۸ -
۱۱- ضرب، ص ٦٧ -

قیمتِ ہر کالہ میدانی کہ چیست
قیمتِ خود را ندانی زاحمقیست
جانِ جملہ علمہا اینست ایں
کہ بدانی من کیم در یومِ دیں[۱۲]

توضیحات :

یہاں جو مفہوم اقبال نے عقل کو ''عقلِ ہزار حیلہ'' (۱) کہہ کر ادا کیا ہے ، وہ رومی کے کلام میں ان الفاظ میں ادا ہوا ہے :

زیں نظر ویں عقل ناید جز دوار (۵)

انسان کے ادراک و عرفان کی جس قوت کو اقبال نے ''چشمِ عشق'' کہا ہے ، وہی قوت ہے جسے رومی نے ''چشمِ غیبی'' اور ''چشمِ دل'' سے تعبیر کیا ہے ۔ باقی اشعار میں اقبال اور رومی کے بیان کا تطابق ہر پہلو سے بخوبی نمایاں ہے ۔

اقبال کا یہ مصرع :

''کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا''

(ضرب ، ص ۸۸)

رومی کے مصرعے :

''در بیانِ جوهر خود چوں خرے'' (۱۲)

کا معنوی پرتو ہے ۔ ''بیانِ جوہر'' (۱۲) ''جوہر کی نمود'' کے بغیر ممکن نہیں ۔

☆ ☆ ☆

۱۲۔ مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۹ ، س ۹ تا ۱۲ ۔

۷۱

عشق ۔ علم و عشق ۔ ذوقِ نظر ۔ علم کی اہمیت

اقبال

علم را مقصود اگر باشد نظر
می شود هم جاده و هم راهبر
علم تفسیرِ جهانِ رنگ و بو
دیده و دل پرورش گیرد ازو
بر مقامِ جذب و شوق آرد ترا
باز چون جبریل بگذارد ترا
عشق کس را کے بخلوت می برد ؟
او ز چشمِ خویش غیرت می برد !
اولِ او هم رفیق و هم طریق
آخرِ او راه رفتن بے رفیق[1]

۱- جاوید : ص ۲۲۲ -

رومی

عاشقم من بر فنِ دیوانگی
سیرم از فرهنگ و از فرزانگی[۲]

عقلِ جزوی عشق را منکر بود
گرچہ بنماید کہ صاحب سر بود
زیرک و داناست امّا نیست نیست
تا فرشتہ لا نشد اهریمنے است[۳]

زیں خرد جاهل همی باید شدن
دست در دیوانگی باید زدن
آزمودم عقلِ دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را[۳]

داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم[۴] است
زیرکی بفروش و حیرانی بخر
زیرکی ظنّ است و حیرانی نظر

۲- مثنوی : ٦ ، ص ۳٦۱ ، س ۸ -
۳- مثنوی : ۱ ، ص ۱۴ ، س ٦ ، ۷ -
۴- مثنوی : ۲ ، ص ۱۱۴ ، س ۲۲ ، ۲۳ -

عقل را قرباں کن اندر عشق دوست

عقلها بارے ازان سویست کوست[5]

هر کجا مشکل جواب آنجا رود

هر کجا پستیست آب آنجا رود

زوع جان را کش جواهر مضمر است

ابر رحمت پُر ز آب کوثر است[6]

چون ز حس بیرون نیامد آدمی

باشد از تصویر غیبی اعجمی[7]

کشف این نز عقل کارافزا شود

بندگی کن تا ترا پیدا شود[8]

گر حجابستت برون رو زاحتجاب

تا ببینی پادشاهیِ عجاب[9]

۵- مثنوی : ۴، ص ۲۳۸، س ۱۹، ۲۱، ۳۰ -
۶- مثنوی : ۳، ص ۱۸۹، س ۵، ۸ -
۷- مثنوی : ۳، ص ۱۵۳، س ۲۴ -
۸- مثنوی : ۳، ص ۱۷۷، س ۲۳ -
۹- مثنوی : ۵، ص ۳۴۹، س ۳۳ -

ور دو چشمِ حق شناس آمد ترا

دوست پر بین عرصۂ هر دوسرا[10]

آدمی دید است ، باقی پوست است

دید آن باشد که دیدِ دوست است

چونکہ دیدِ دوست نبود کور بہ

دوست کو باقی نباشد دور بہ[11]

توضیحات :

اقبال کے الفاظ ''ز چشمِ خویش غیرت می برد'' (۱) ترکِ رفاقتِ حواس کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ الفاظ ''راہ رفتن بے رفیق'' (۱) عقل سے رہنمائی حاصل کرنے کا سلسلہ چھوڑنے کی طرف - رومی کے بیان میں یہ مفہوم ان الفاظ میں مضمر ہے :

چون ز حس بیرون نیامد آدمی

باشد از تصویرِ غیبی اعجمی (۷)

اور ان الفاظ میں :

زین خرد جاهل همی باید شدن (۸)

اس کے علاوہ یہ لطیف نکتہ قابلِ بیان ہے کہ رومی کی مثنوی کے جس مقام سے اشعار (۳) لیے گئے ہیں وہاں اسی سیاق میں

۱۰- مثنوی : ٦ ، ص ۳۹۹ ، س ۴۱ -

۱۱- مثنوی : ۱ ، ص ۳۰ ، س ۲٦ -

یہ دو شعر آتے ہیں :

عاشق از حق چوں غذا یابد رحیق
عقل آنجا گم شود گم اے رفیق

اور

بر کشا از نور پاک شہ نظر
تا نپنداری تو چوں کوتہ نظر

ان میں سے پہلے شعر کا ایک فکری اور فنی سایہ اقبال کے شعر :

''اول او هم رفیق و هم طریق
آخر او راه رفتن بے رفیق'' (۱)

کے پس منظر میں صاف نظر آتا ہے - اسی طرح رومی کا مصرع ''بر کشا از نور پاک شہ نظر'' (مذکورہ بالا) اقبال کے اس مصرعے :

''علم را مقصود اگر باشد نظر'' (۱)

مَیں اپنی جھلک دکھا رہا ہے -

☆ ☆ ☆

۷۲

عشق - علمِ با عشق و علمِ بے عشق

اقبال

علم را بر اوجِ افلاک است رہ
تا ز چشمِ مہر بر کندد نگہ
چشمِ او بر وارداتِ کائنات
تا ببیند محکماتِ کائنات
دل اگر بندد بہ حق پیغمبری ست
ور ز حق بیگانہ گردد ، کافری ست
علم را بے سوزِ دل خوانی ، شراست
نورِ او تاریکیِ بحر و بر است
قوتش ابلیس را یارے شود
نور ، نار از صحبتِ نارے شود
کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاهوتیاں

بے محبّت علم و حکمت مردۀ [illegible]
عقل تیرے بر هدف ناخوردۀ

کور را بیننده از دیدار کن
بو لہب را حیدرِ کرّار کن[1]

رومی

هم سوال از علم خیزد، هم جواب
همچنانکہ خار و گل از خاک و آب

هم هلاک از علم خیزد، هم هدی
هم چنانکہ تلخ و شیریں از ندی

ز آشنائی خیزد ایں بغض و ولا
وز غذاے خوش بود سقم و شفا[2]

صد هزاران فضلِ دارد از علوم
جانِ خود را می‌نداند ایں ظلوم

۱- جاوید، ص ۸۲، ۸۳ -
۲- مثنوی : ۴، ص ۲۶۴، س ۱۰، ۱۱ -

داند او خاصیتِ هر جوهرے
در بیانِ جوهرِ خود چون خرے

کہ همی دانم یجوز و لایجوز
این ندانی تو کہ حوری یا عجوز

این روا و ناروا دانی ، ولیک
خود روا یا ناروائی بین تو نیک

قیمتِ هر کالہ میدانی کہ چیست
قیمت خود را ندانی ز احمقیست

جانِ جملہ علمها اینست این
کہ بدانی من کیم در یومِ دین[۳]

اے بسا عالم ز دانش بے نصیب
حافظِ علم است آن کس ، نے حسیب[۴]

علمهاے اهلِ دل حمّال شان
علمهاے اهلِ تن احمال شان

علم چون بر دل زند یارے شود
علم چون بر تن زند بارے شود

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۹ ، س ۹ تا ۱۲ -
۴- مثنوی : ۲ ، ص ۱۸۶ ، س ۹ -

علم کان نبود زھو بے واسطہ
آں نپاید ھمچو رنگ ماشطہ

ھیں مکش بھر خدا ایں بار علم
تا ببینی در دروں انبار علم

خویش را صافی کن از اوصاف خود
تا ببینی ذات پاک صاف خود

بینی اندر دل علوم انبیاء[۴]
بے کتاب و بے معید و اوستا[۵]

اے شہاں کشتیم ما خصم بروں
ماند خصمے زاں بتر در اندروں

کشتن ایں کار عقل و ھوش نیست
شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

سہل شیرے داں کہ صفہا بشکند
شیر آں باشد کہ خود را بشکند[٦]

گر نخواھی ھر دمے ایں خفت و خیز
کن ز خاک پاے مردے چشم تیز

۵- مثنوی : ۱ ، ص ٦۸ ، س ۱۳ تا ۱۵ ، ۲۰ -
٦- مثنوی : ۱ ، ص ۳۰ ، س ۷ ، ۱۵ -

که ازین شاگردی و زین فتقار

سوزنے باشی ، شوی تو ذوالفقار

چشم روشن کن ز خاکِ اولیاء

تا ببینی ز ابتدا تا انتہا[7]

از علیؓ میراث داری ذوالفقار

بازوے شیر خدا هستت ، بیار[8]

هر که مرد اندر تن او نفسِ گبر

مر ورا فرمان برد خورشید و ابر[9]

نفسِ خود را کش جہانے زندہ کن

خواجۂ گشتہ ست او را بندہ کن[10]

توضیحات :

رومی کے اشعار میں علم کی متضاد کیفیات بیان ہوئی ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ علم کو کس طرح تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ نیز

۷- مثنوی : ۲ ، ص ۲۷۰ ، س ۷ تا ۹ -

۸- مثنوی : ۵ ، ص ۳۱ ، س ۳۷ -

۹- مثنوی : ۱ ، ص ۶۰ ، س ۲۶ -

۱۰- مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۷ ، س ۱۱ -

اس کی تطہیر کس طرح کی جا سکتی ہے اور کون سا علم انسان کی زندگی کے لیے واقعی قدر و قیمت رکھتا ہے ۔ اقبال نے بھی یہی سب باتیں کہی ہیں ۔ یہاں یہ بالکل واضح ہے کہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ رومی کے کلام سے مستفاد ہے ، لیکن اقبال نے ان حقائق کو جدّتِ تعبیر اور حسنِ ایجاز کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

اقبال کے ان مشہور اشعار میں ، جو پیرِ رومی اور مریدِ ہندی کے عنوان کے تحت ہیں ، رومی کے انھی اشعار میں سے یہ شعر ''علم چون بر دل زند'' الخ (۵) جزوی تصرّف کے ساتھ آیا ہے ۔ رومی نے علم کی قوت و طاقت اور قوتِ تسخیر کے بیان میں ، جو تسخیرِ نفس سے حاصل ہوتی ہے ، کہا ہے :

''از علی میراث داری ذوالفقار
بازوے شیر خدا هستت بیار''(۸)

''هر کہ مرد اندر تن او نفس گبر
مر ورا فرمان برد خورشید و ابر''(۹)

اقبال نے بھی یہی تلمیح استعمال کی ہے :

کور را بیننده از دیدار کن
بو لهب را حیدرِ کرّار کن (۱)

رومی کے شعر (۸) کا ایک نکتہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں بھی بیان کیا ہے :

مرتضیٰ کز تیغِ او حق روشن است
بوتراب از فتحِ اقلیمِ تن است

هر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

(اسرار ، ص ۵۳)

مولانا رومی تزکیۂ نفس اور تسخیرِ نفس کو 'کشتن' سے تعبیر کرتے ہیں : (شعر ۶ ، نیز شعر ۹) ۔ اقبال نے بھی یہی انداز بیان اختیار کیا ہے :

کشتنِ ابلیس کارِ مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است (۱)

☆ ☆ ☆

۷۳

عشق ۔ عشق اور تہذیب و تمدن

اقبال

زندگی را شرع و آئین است عشق
اصلِ تہذیب است دیں ، دین است عشق[1]

رومی

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما[2]

از دو پارہ پیہ آں نورِ رواں
موجِ نورش میرود تا آسماں

۱- جاوید ، ص ۱۲۹ -
۲- مثنوی : ۱ ، ص ۲ ، س ۱٦ -

گوشت پاره که زبان آمد ازو
میرود سیلابِ حکمت همچو جو
سوے سوراخے که نامش گوش ها ست
تاباغِ جان که میوه اش هوش ها ست
شاهراهِ باغِ جان ها شرع اوست
باغِ و بستان هاے عالم فرعِ اوست[۳]

گر تو خواهی کت شقاوت کم شود
جهد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتے کز طبع آید، وز خیال
حکمتے بے فیضِ نورِ ذوالجلال
حکمتِ دنیا فزاید ظن و شک
حکمتِ دینی برد فوقِ فلک[۴]

چونکه تقوی بست دو دستِ هوا
حق کشاید هر دو دستِ عقل را[۵]

انبیاء در قطعِ اسباب آمدند
معجزاتِ خویش بر کیوان زدند

۳- مثنوی : ۲، ص ۱۱٦، س ۳۵، ۳٦ -
۴- مثنوی : ۲، ص ۱۲۸، س ۷، ۸ -
۵- مثنوی : ۳، ص ۱٦٦، س ۳۰ -

بے سبب مر بحر را بشگافتند
بے زراعت چاش گندم یافتند
ریگہا هم آرد شد از سعی شان
پشم بز ابریشم آمد کشکشان
جمله قرآن است در قطع سبب
عز درویش و هلاک بولہب[۶]

معدن گرمے است اندر لامکان
هفت دوزخ از شرارش یک دخان[۷]

ز آتش مومن ازین رو اے صفی
میشود دوزخ ضعیف و منطفی
گویدش بگذر سبک ، اے محتشم
ورنه ز آتشہاے تو در آتشم[۸]

روح رہزن مرد و تن که تیغ اوست
هست باقی در کف آن غزوه دوست

۶- مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۷ ، س ۱۷ تا ۱۹ -
۷- مثنوی : ۳ ، ص ۲۲۰ ، س ۲۵ -
۸- مثنوی : ۶ ، ص ۴۲۰ ، س ۲۷ -

نفس چون مبدل شود این تیغِ تن

باشد اندر دستِ صنعِ ذوالمنن[9]

آنکه بر افلاک رفتارش بود

بر زمین رفتن چه دشوارش بود[10]

این جهادِ اکبر است ، آن اصغر است

هر دو کارِ رستم است وحیدر است[11]

نارِ بیرونی به آبے بفسرد

نارِ شهوت تا بدوزخ می برد

چه کشد این نار را ، نورِ خدا

نورِ ابراهیم را ساز اوستا[12]

نفس فرعون است ، هین سیرش مکن

تا نیارد یاد زان کفرِ کهن

۹- مثنوی : ۵ ، ص ۳۴۳ ، س ۳۰ ، ۳۱ -

۱۰- مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۱ ، س ۳۸ -

۱۱- مثنوی : ۵ ، ص ۳۴۳ ، س ۱۰ -

۱۲- مثنوی : ۱ ، ص ۷۲ ، س ۱۲ ، ۱۳ -

گر بگرید ور بنالد زار زار
او نخواهد شد مسلمان ، هوش دار[۱۳]

نفس خود را کش ، جهانے زنده کن
خواجهٔ گشته ست او را بنده کن[۱۴]

نفس و شیطان هر دو یک تن بوده اند
در دو صورت خویش را بنموده اند
چون فرشته و عقل کایشان یک بدند
بهر حکمت هاش دو صورت شدند
دشمنے داری چنین در سرِّ خویش
مانع عقل است و خصمِ جان و کیش[۱۵]

عقلِ جزوی عشق را منکر بود
گرچه بنماید که صاحب سر بود
زیرک و داناست امّا نیست نیست
تا فرشته لا نشد ، اهریمنے است[۱۶]

۱۳- مثنوی : ۴ ، ص ۲۷۴ ، س ۱ ، ۲ -
۱۴- مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۷ ، س ۱۱ -
۱۵- مثنوی : ۳ ، ص ۲۰۲ ، س ۲۲ ، ۲۳ -
۱٦- مثنوی : ۱ ، ص ۱۴ ، س ٦ ، ۷ -

هر کہ در خلوت بہ بینش یافت راہ
او ز دانش ھا نجوید دست گاہ
با جمال جان چو شد ہم کاسہ
باشدش ز اخبار و دانش تاسہ[۱۷]

خاتمِ ملکِ سلیمان است علم
جملہ عالم صورت و جان است علم
آدمی را زین ہنر بےچارہ گشت
خلقِ دریاھا و خلقِ کوہ و دشت
زو پلنگ و شیر ترسان ہمچو موش
زو شدہ پنہان بدشت و کُہ وحوش
زو پری و دیو ساحل ھا گرفت
ہر یکے در جاے پنہان جا گرفت[۱۸]

آدمی را دشمنِ پنہان بسے است
آدمیِ با حذر ، عاقل کسے است[۱۹]

توضیحات :

اقبال نے اپنے شعر (۱) میں ان تمام نکات کو ایک جگہ جمع

۱۷- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۹ ، س ۹ -
۱۸- مثنوی : ۱ ، ص ۲۳ ، س ۲۶ تا ۲۸ -
۱۹- مثنوی : ۱ ، ص ۲۳ ، س ۲۸ -

کر دیا ہے جو رومی کے اشعار (۲) تا (۱۹) میں مختلف پیرایوں میں بیان ہوئے ہیں ۔ اقبال نے عشق کو زندگی کے لیے ''شرع'' و ''آئین'' و ''دین'' (۱) کہا ہے ۔ رومی کے بیان میں لفظ ''شرع'' شعر (۳) میں اور لفظ ''دین'' شعر (۴) میں آیا ہے ۔ دوسرے متفرق اشعار میں آئین اخلاق کی ضرورت اور اہمیت واضح کی گئی ہے ۔

☆ ☆ ☆

۷۲

عشق۔ فقرِ کافر اور فقرِ مومن

اقبال

فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است
فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است
زندگی آں را سکونِ غار و کوہ
زندگی ایں را ز مرگِ با شکوہ
آں خدا را جستن از ترکِ بدن
ایں خودی را بر فسانِ حق زدن
آں خودی را کشتن و واسوختن
ایں خودی را چوں چراغ افروختن
فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر
از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حنین
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسین[۴]

فقر را تا ذوقِ عریانی نماند
آن جلال اندر مسلمانی نماند[1]

روسی

فقر فخری نہ از گزاف است و مجاز
صد هزاران عزّ پنهان است و ناز[2]

هین مکن خود را خصی ، رهبان مشو
زانکہ عفّت هست شهوت را گرو
بے هوا نہی از هوا ممکن نبود
هم غزا با مردگاں نتواں نمود[3]

مرغ گفتش خواجہ در خلوت مایست
دین احمدؐ را ترهّب نیک نیست
از ترهّب نہی فرمود آں رسولؐ
بدعتے چوں برگرفتی اے فضول ؟
جمعہ شرط است و جماعت در نماز
امرِ معروف و ز منکر احتراز[4]

۱- پس ، ص ۲۶ ، ۲۷ -
۲- مثنوی : ۱ ، ص ۴۸ ، س ۲۳ -
۳- مثنوی : ۵ ، ص ۲۸۸ ، س ۱۷ ، ۱۸ -
۴- مثنوی : ۶ ، ص ۳۵۹ ، س ۲۲ ، ۲۳ -

توضیحات :

رومی نے حدیثِ نبوی ''الفقر فخری'' سے استفادہ کر کے اسلامی فقر کو ''سرمایۂ عزّ و ناز'' (۲) بتایا ہے ۔ اقبال نے حدیث ''الفقر فخری'' کے ساتھ حدیث نبوی ''لی خرقتان الفقر و الجہاد'' کو بھی ساتھ ساتھ نظر میں رکھ کر فقرِ مومن کو ''لرزۂ بحر و بر'' (۱) اور شہادتِ مومن کو ''مرگِ با شکوہ'' (۱) کہا ہے ــــــــــ

☆ ☆ ☆

۷۵

عشق ۔ حسّی ادراک اور وجدان

اقبال

خودی از کائناتِ رنگ و بو نیست
حواسِ ما میانِ ما و او نیست
نگہ را در حریمش نیست راہے
کنی خود را تماشا بے نگاہے[1]

رومی

زین قدم وین عقل رو ، بیزار شو
چشمِ غیبی جوی و برخوردار شو[2]

عاقل آں باشد کہ او با مشعلہ است
او دلیل و پیشواۓ قافلہ است

۱- زبور ، ص ۲۳۶ ، ۲۳۷ -
۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۶۹ ، س ۹ -

پیروِ نورِ خود است آں پیش رو
تابعِ خویش است آں با خویش رو
مومنِ خویش است و ایمان آورید
هم باں نورے کہ جانش زاں چرید[۳]

عقل در شرحش ، چو خر در گل بخفت
شرحِ عشق و عاشقی هم عشق گفت[۴]

توضیحات :

"حواسِ ما میان ما و او نیست"

اقبال کا یہ مصرع اس حقیقت کا آئینہ دار ہے جسے رومی نے اپنے شعر (۴) میں بڑے معنی خیز انداز میں بیان کیا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۳۔ مثنوی : ۴ ، ص ۲۵۰ ، س ۳۰ ، ۳۱ ۔
۴۔ مثنوی : ۱ ، ص ۴ ، س ۳۲ ۔

٧٦

عشق ـ مراتبِ وجدان ـ مراتبِ معرفت

اقبال

می شود از بہرِ اغراضِ عمل
عامل و معمول و اسباب و علل
خیزد ، انگیزد ، پرد ، تابد ، رمد
سوزد ، افروزد ، خرامد ، پر زند
وسعتِ ایّام جولاں گاہِ او
آسماں موجے ز گردِ راہِ او
شعلۂ خود در شرر تقسیم کرد
جز پرستی عقل را تعلیم کرد
خود شکن گردید و اجزا آفرید
اندکے آشفت و صحرا آفرید
باز از آشفتگی بیزار شد
وز بہم پیوستگی کہسار شد

قوتِ خاموش و بے تابِ عمل
از عمل پابندِ اسبابِ عمل[1]

رومی

هست دل مانندۂ خانۂ کلاں
خانۂ دل را نہاں همسایگاں —
از شگاف و روزنِ دیوار ہا
مطّلع گردند بر اسرارہا[2]

توضیحات :

رومی کے ''شگاف و روزنِ دیوارہا'' کے مفہوم کو اقبال نے ''اجزا'' کہہ کر ادا کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

۱- اسرار ، ص ۱۳ ، ۱۴ -
۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۴۴ ، س ۱۳ -

۷۷

عشق ۔ سفر در حضر ۔ سیرِ باطن

اقبال

سفر در خویش ؟ زادن بے اب و مام
ثریّا را گرفتن از لبِ بام
ابد بردن بہ یک دم اضطرابے
تماشا بے شعاعِ آفتابے
ستردن نقشِ ہر امید و بیمے
زدن چاکے بہ دریا چون کلیمے
شکستن ایں طلسمِ بحر و بر را
ز انگشتے شگافیدن قمر را
چنان باز آمدن از لامکانش
درونِ سینہ او ، در کف جہانش[1]

۱- زبور ، ص ۲۲۵ -

می نداند عشق سال و ماه را
دیر و زود و نزد و دورِ راہ را[2]

روسی

میرِ احوال است ، نے موقوفِ حال
بندۂ ایں ماہ باشد ماہ و سال
چوں بگوید حال را ، فرماں کند
چوں بخواہد جسم ہا را ، جاں کند
منتہی نبود کہ موقوف است او
منتظر بنشستہ باشد حال جو
کیمیائے حال باشد ، دستِ او
دست جنباند شود مے مستِ او
گر بخواہد مرگ ہم شیریں شود
خار و نشتر نرگس و نسریں شود
او بود سلطانِ حال اندر روش
نے چو تو محروم از حال و کشش
آنکہ او موقوفِ حال است آدمیست
کہ گہے افزون و گاہے در کمیست[3]

۲- جاوید ، ص ۱۷ :
۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۵۹ ، س ۳۳ تا ۳۶ -

آنکه او بے نقش و سادہ سینہ شد
نقش ہائے غیب را آئینہ شد[۴]

از رہ و منزل ، ز کوتاہ و دراز
دل چہ داند کوست مست و دلنواز
آں دراز و کوتہ اوصافِ تن است
رفتنِ ارواح دیگر رفتن است
سیرِ جاں بیروں بود از دورِ دیر
جسم ہا از جاں بیاموزند سیر[۵]

سیرِ زاہد ہر مہے یک روزہ راہ
سیرِ عارف ہر دمے تا تختِ شاہ[۶]

عشق جوشد بحر را مانندِ دیگ
عشق ساید کوہ را مانندِ ریگ
عشق بشگافد فلک را صد شگاف
عشق لرزاند زمیں را از گزاف[۷]

۴- مثنوی : ۱ ، ص ۶۳ ، س ۲ -
۵- مثنوی : ۳ ، ص ۱۶۸ ، س ۲۰ - ص ۱۶۹ ، س ۱ -
۶- مثنوی : ۲ ، ص ۸۱ ، س ۳۰ -
۷- مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۵ ، س ۲۶ ، ۲۷ -

توضیحات :

سفر در حضر یا سیرِ باطن احوالِ عشق میں سے ایک حال ہے جس کی بدولت صاحبِ حال کے لیے کائنات میں جو تصرّفات اور فتوحات ممکن ہیں ان کا مندرجہ بالا اشعار میں ذکر کیا گیا ہے ۔ اس ضمن میں رومی نے زمان و مکان اور بحر و بر کی تسخیر ، حکمت و معرفت اور علم و قدرت کے کمالات بیان کیے ہیں ۔ اقبال کے اشعار میں اوصاف اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ انسان کامل یعنی پیغمبر ﷺ اکرم کی عظمتِ شان ، معراج اور کمالات کا جلوہ نظر آتا ہے ۔

رومی نے عشق کی سیرِ باطن اور سفر در حضر کی کیفیت بیان کرتے ہوئے 'ماہ و سال'(۳) کی نفی کی ہے ۔ اقبال نے اس ضمن میں الفاظ ''سال و ماہ'' اور ''نزد و دور'' لا کر اپنے ایک ہی شعر میں زمان اور مکان دونوں کی نفی کر دی ہے ۔

۷۸

عشق ۔ عشق اور وجدان و عرفان

اقبال

فروغِ دانشِ ما از قیاس است

قیاسِ ما ز تقدیرِ حواس است

چو حس دیگر شد ، ایں عالم دگر شد

سکون و سیر و کیف و کم دگر شد[1]

رومی

خاک زن بر دیدۂ حس بینِ خویش

دیدۂ حس دشمنِ عقل است و کیش

دیدۂ حس را خدا اعماش خواند

بت پرستش خواند و ضدِ ماش خواند

۱- زبور ، ص ۲۳٦ -

زانکہ او کف دید و دریا را ندید
زانکہ حالے دید و فردا را ندید[۲]

گر نبودے حسِّ دیگر مر ترا
جز حسِ حیوان ز بیرونِ هوا
پس بنی آدم مکرّم کے بدے
کے بحسِّ مشترک محرم شدے[۳]

پنبہ آں گوشِ سر ، گوشِ سر است
تا نگردد ایں کر ، آں باطن کر است
بے حس و بے گوش و بے فکرت شود
تا خطابِ ارجعی را بشنود[۴]

پنج حسّے هست جز ایں پنج حس
آں چو زرِ سرخ و ایں حسها چو مس
اندراں بازار کاهلِ محشر اند
حسِّ مس را چوں حسِ زر کے خرند

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۰۳ ، س ۳۴ ، ۳۵ -
۳- مثنوی : ۲ ، ص ۸۰ ، س ۷ -
۴- مثنوی : ۱ ، ص ۱۴ ، س ٦ -

حسِ ابدان ، قوتِ ظلمت میخورد
حسِ جان از آفتابے می چرد[۵]

چشمِ حس را هست مذهب اعتزال
دیدهٔ عقل است سنّی در وصال
هرکه بیرون شد ز حس سعیِ ویست
اهلِ بینش اهلِ عقلِ خوش پیست[۶]

چون درِ معنی زنی ، بازت کنند
پرِ فکرت زن که شهبازت کنند
پرِ فکرت شد گل آلود و گران
زانکه گل خواری ، ترا گل شد چو نان[۷]

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بجوشد آبت از بالا و پست
تا بسقاهم ربّهم آید خطاب
تشنه باش ، اللّه اعلم بالصواب[۸]

۵- مثنوی : ۲ ، ص ۹۷ ، س ۲۵ ، ۲۶ -
۶- مثنوی : ۲ ، ص ۸۰ ، س ۴ ، ۵ -
۷- مثنوی : ۱ ، ص ۵۸ ، س ۱۱ -
۸- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۹ ، س ۵ ، ۹ -

این جهانِ منتظم محشر بود
گر دو دیده مبدل و انور شود[9]

آئینۂ هستی چہ باشد نیستی
نیستی بگزین ، گر ابلہ نیستی
هستی اندر نیستی بتواں نمود
مالداراں بر فقیر آرند جود[10]

حالِ و قالے از ورائے حال و قال
غرق گشتہ در جمالِ ذوالجلال
فرقۂ نے کہ خلاصے باشدش
یا بجز دریا کسے بشناسدش

عقلِ جزو از کُل پذیرا نیستے
گر تقاضا بر تقاضا نیستے
چوں تقاضا بر تقاضا می رسد
موجِ آں دریا بدینجا می رسد[11]

۹- مثنوی : ٦ ، ص ۳٦۵ ، س ۹ -
۱۰- مثنوی : ۱ ، ص ٦۴ ، س ۴ ، ۵ -
۱۱- مثنوی : ۱ ، ص ۴۵ ، س ۲۵ ، ۲٦ -

دانش انوار است در جانِ رجال
نے ز راہِ دفتر و نے قیل و قال
دانشِ آنرا ستاند جان ز جان
نے ز راہِ دفتر و نے از بیان
تا دلش را شرح آن سازد ضیا
پس الم نشرح بفرماید خدا
کاندرون سینہ شرحت دادہ ایم
شرح اندر سینہ ات بنہادہ ایم
در نگر در شرح دل در اندرون
تا نیاید طعنۂ "لا یبصرون"[۱۲]

نصّ وحیِ روحِ قدسی دان یقین
وان قیاسِ عقلِ جزوی تحت این
عقل از جان گشت با ادراک و فر
روح اورا کے شود زیرِ نظر
لیک جان در عقل تاثیرے کند
زان اثر آن عقل تدبیرے کند
نوح وار ار صدقے زد در تو روح
کو یم و کشتی و کو طوفانِ نوح[۱۳]

۱۲- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۶ ، س ۱۷ تا ۱۹ ، ۲۲ -
۱۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۴ ، س ۳۴ ، ۳۵ -

صد دلیل آرد مقلّد در بیان
از قیاسے گوید او را لز عیاں
مشک آلودہ ست ، امّا مشک نے
بوے مشکستش ، ولے جز پشک نے[14]

پاے استدلالیاں چوبیں بود
پاے چوبیں سخت بے تمکیں بود[15]

اندریں بحث ار خرد رہ بیں بدے
فخرِ رازی رازدارِ دیں بدے
لیک چوں من لم یذق لم یدر بود
عقل و تخئیلاتِ او حیرت فزود[16]

کُلِّ عالم صورتِ عقلِ کل است
کوست بابای ہر آنک اہل قل است
چوں کسے با عقلِ کل کفراں فزود
صورتِ کل پیش او ہم سگ نمود

۱۴- مثنوی : ۵ ، ۳۲۱ ، س ۱۰ -
۱۵- مثنوی : ۱ ، ص ۴۴ ، س ٦ -
۱٦- مثنوی : ۵ ، ص ۳۴۹ ، س ۲ ، ۳ -

صلح کن با این پدر عاقے بهل
تا کہ فرش زر نماید آب و گل
پس قیامت نقد حال تو بود
پیش تو چرخ و زمیں مبدل شود
من کہ صلحم دائما با این پدر
این جهان چون جنتستم در نظر
هر زمان نو صورتے و نو جمال
تا ز نودیدن فرو میرد ملال
من همی بینم جهان را پر نعیم
آب ها از چشمہ ها جوشان مقیم
بانگ آبش میرسد در گوش من
مست می گردد ضمیر و هوش من
شاخها رقصان شده چون ماهیان
برگ ها کف زن مثال مطربان
برق آیینہ است لامع از نمد
گر نماید آیینہ تا چون بود
از هزاران من نمیگویم یکے
زانکہ آگنده است هر گوش از شکے
پیش وهم این گفت مژده دادنست
عقل گوید مژده چہ نقد منست[۱۷]

۱۷- مثنوی : ۳ ، ص ۲٦۸ ، س ۱٦ تا ۲۱ -

جان شناسان از عدوها فارغ اند
غرقهٔ دریاے بیچون اند و چند

جان شو و از راہِ جان جان را شناس
یارِ بینش شو، نہ فرزندِ قیاس[۱۸]

آنچہ او بیند نتان کردن مساس
نز قیاسِ عقل و نز راہِ حواس[۱۹]

توضیحات :

مدرکاتِ حسّی کے مقابل وجدانِ عشق کی فعّالیت اور عظمت و اہمیت رومی نے مندرجہ اشعار (۲ تا ۱۹) میں تفصیل سے بیان کی ہے - اقبال کے اشعار (۱) میں کلیدی الفاظ ''قیاس و حواس'' ہیں جو اسی موضوع کی بحث میں رومی کے اشعار ۱۳، ۱۴، ۱۸، ۱۹ میں آئے ہیں - دوسرے اشعار میں ''حواس'' کا واحد ''حس'' اور حواس و قیاس کے مترادفات یا ان کے لوازم اور متناسب الفاظ استعمال ہوئے ہیں -

☆ ☆ ☆

۱۸- مثنوی : ۳، ص ۱۸۸، س ۳۰، ۳۱ -
۱۹- مثنوی : ۵، ص ۳۰۱، س ۱۵ -

۷۹

عشق ۔ عشق اور تسخیرِ ارض

اقبال

خاک گشتن مذہبِ پروانگی است
خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است[1]

رومی

مردنِ تن در ریاضت زندگی ست
رنجِ ایں تن روح را پایندگی ست[2]

تا بقائے خود نبیند سالکے
چوں کند تن را سقیم و ھالکے

۱۔ اسرار، ص ۸۰ ۔
۲۔ مثنوی : ۳، ص ۱۹۱، س ۱۹ ۔

این ریاضتهاے درویشان چراست
کاں بلا بر تن بقاے جان ماست[۳]

سهل شیرے داں کہ صفها بشکند
شیر آں باشد کہ خود را بشکند[۴]

هرکہ مرد اندر تن او نفس گبر
مر ورا فرمان برد خورشید و ابر[۵]

زیں همرهان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست[۶]

چوں بمردی تو ز اوصاف بشر
بحر اسرارت نهد بر فرق بر[۷]

توضیحات :

رومی نے اپنے نفس کی تسخیر کرنے والے کو ''شیر'' (۴) کہا

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۹۱ ، س ۱۱ -
۴- مثنوی : ۱ ، ص ۳۰ ، س ۱۵ -
۵- مثنوی : ۱ ، ص ۶۰ ، س ۲۶ -
۶- دیوان : بیت شمارہ ۴۶۳۵ -
۷- مثنوی : ۱ ، ص ۵۷ ، س ۲۵ -

ہے ۔ اقبال نے ''مردانگی'' کی صفت کا ذکر کیا ہے جو رومی کے بیان میں ''شیر'' کے استعارے کی بنیاد ہے اور وجہ جامع یعنی شجاعت کا ایک مترادف ۔ اس کے علاوہ ''خاک را اب شو'' (۱) میں حضرت علیؑ کے لقب ابو تراب کی تلمیح ہے ۔ رومی کے شعر (۶) میں حضرت علیؑ کا لقب ''شیر خدا'' آیا ہے ۔

☆ ☆ ☆

۸۰

عشق ۔ حصولِ کمالِ انسانی

اقبال

زیرکی از عشق گردد حق شناس

کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود

نقش بندِ عالمِ دیگر شود[1]

رومی

خاتمِ ملکِ سلیماں است علم

جملہ عالم صورت و جاں است علم

آدمی را زیں ہنر بے چارہ گشت

خلقِ دریا ہا و خلقِ کوہ و دشت

۱۔ جاوید ، ص ۷۱ ۔

زو پلنگ و شیر ترساں ہمچو موش
زو شدہ پنہاں بدشت و کُہ وحوش
زو پری و دیو ساحل ہا گرفت
ہر یکے در جاے پنہاں جا گرفت
آدمی را دشمنِ پنہاں بسے است
آدمئے با حذر ، عاقل کسے است[۲]

اے شہاں کشتیم ما خصمِ بروں
ماند خصمے زاں بتر در اندروں
کشتنِ ایں کارِ عقل و ہوش نیست
شیرِ باطن سخرۂ خرگوش نیست
سہل شیرے داں کہ صفہا بشکند
شیر آں باشد کہ خود را بشکند[۳]

چونکہ تقویٰ بست دو دستِ ہوا
حق کشاید ہر دو دستِ عقل را[۴]

عقل را قرباں کن اندر عشقِ دوست
عقلہا بارے ازاں سویست کوست[۵]

۲- مثنوی : ۱ ، ص ۲۳ ، س ۲۶ تا ۲۸ -
۳- مثنوی : ۱ ، ص ۳۰ ، س ۷ ، ۱۵ -
۴- مثنوی : ۳ ، ص ۱۶۶ ، س ۳۰ -
۵- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۸ ، س ۳۰ -

توضیحات :

یہاں علم کو اقبال نے ''زیرکی'' (۱) کہا ہے - یہ لفظ رومی کا ہے :

''زیرکی بفروش و حیرانی بخر''

(مثنوی ، ۴ : ص ۲۳۸ ، س ۲۱)

اقبال نے کہا ہے :

''عشق چوں با زیرکی همبر شود
نقشبندِ عالمِ دیگر شود'' (۱)

رومی نے عشق کی عظمت 'عالم' کے حوالے سے یوں بتائی ہے :

''جملہ عالم صورت و جان است علم'' (۲)

اقبال نے عشق اور علم کے باہم متحد ہو جانے کی اہمیت واضح کی ہے - رومی نے اس نکتے کو یوں بیان کیا ہے :

''عقل را قرباں کن اندر عشقِ دوست''(۵)

☆ ☆ ☆

۸۱

عشق ۔ مظاہرِ عشق

اقبال

بہ برگِ لالہ رنگ آمیزیِ عشق
بجانِ ما بلا انگیزیِ عشق
اگر این خاکدان را واشگافی
درونش بنگری خون ریزیِ عشق[1]

رومی

دورِ گردوں ہا ز موجِ عشق داں
چوں نبودے عشق بفسردے جہاں
کے جمادے محو گشتے در نبات
کے فدائے روح گشتے نامیات[2]

۱- پیام ، ص ۱۳ -
۲- مثنوی : ۵ ، ص ۳۴۴ ، س ۱۴ ، ۱۵ -

زانکہ بے حاجت خداوند عزیز
مے نہ بخشد ہیچ کس را ہیچ چیز
پس کمند ہست ہا حاجت بود
قدرِ حاجت مرد را آلت بود
پس چو حاجت شد کمندِ ہست ہا
قدرِ حاجت مے رسد از حق عطا[3]

توضیحات :

رومی نے کہا ہے کہ ''دورِ گردوں'' (۲) ''جہانِ مادی'' (۲) ''جمادات و نباتات'' اور ''ذی روح موجودات'' کا وجود ''موجِ عشق'' کی بدولت ہے - اقبال نے اپنے فنکارانہ انداز میں نباتات کے لیے ''برگ لالہ'' (۱) ، انسان کے لیے ''بجانِ ما'' (۱) اور پورے کرۂ ارض کے لیے ''خاکدان'' (۱) اور ''درونِ خاکداں'' (۱) الفاظ استعمال کیے ہیں اور عشق کی مختلف فعّالیتوں کو ''رنگ آمیزی'' ، ''بلا انگیزی'' اور ''خونریزی'' سے تعبیر کیا ہے -

☆ ☆ ☆

۳- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۹ ، س ۱۳ ، ۱۵ ، ۱۶ -

۸۲
عشق اور زمان و مکان

اقبال

عشق سلطان است و برہانِ مبیں
ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں
لا زمان و دوش و فردائے ازو
لا مکان و زیر و بالائے ازو[1]

رومی

ہر دمے او را یکے معراجِ خاص
بر سرِ فرقش نہد حق تاجِ خاص
صورتش در خاک و جاں در لامکاں
لامکانے فوقِ وہمِ سالکاں

۱- جاوید ، ص ۱۸ -

لامکانے نے کہ در وہم آیدت
ہر دمے در وے خیالے زایدت
بل مکان و لامکاں در حکمِ او
ہمچو در حکمِ بہشتے چارجو[۲]

توضیحات :

رومی نے عشق کی شانِ تاج داری کی طرف اشارہ کیا ہے :

''بر سرِ فرقش نہد حق تاج خاص'' (۲)

اقبال نے عشق کو ''سلطان'' کہا ہے جو ذومعنیین ہے - رومی نے عشق کی ''معراج خاص'' کا ذکر کیا ہے - اقبال نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے :

''ہر دو عالم عشق را زیر نگیں'' (۱)

اس ضمن میں رومی نے ''مکان و لا مکاں'' (۲) کو عشق کے زیرِ فرمان بتایا ہے - اقبال نے بھی ''لا مکاں'' کہا ہے اور مکان کے لیے ''زیر و بالا'' الفاظ استعمال کیے ہیں - رومی نے ''مکان و لامکاں'' کہا تو اس میں ''زمان و لازماں'' کا مفہوم بھی آ گیا - اقبال نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں واضح کر دیا ہے :

''لا زمان و دوش و فردائے ازو'' (۱)

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۱ ، ص ۳۴ ، س ۳ - ۴ - ٦ -

۸۳

عقل ۔ شہود و شاہد و مشہود ۔ عارف و معروف کا اتحاد اور فراق

اقبال

خودی را زندگی ایجادِ غیر است
فراقِ عارف و معروف خیر است
جدائی خاک را بخشد نگاہے
دہد سرمایۂ کوہے بہ کاہے
جدائی عشق را آئینہ دار است
جدائی عاشقاں را سازگار است[1]

رومی

صورت از بے صورتی آمد بروں
باز شد کانّا الیہ راجعون

۱- زبور ، ص ۲۱۹ ، ۲۲۰ -

پس ترا ہر لحظہ مرگ و رجعت است
مصطفیٰؐ فرمود دنیا ساعت است

ہر نفس نو می شود دنیا و ما
بے خبر از نو شدن اندر بقا

عمر ہم چوں جوئے نو نو می رسد
مستمّری می نماید در جسد

شاخ آتش چوں بجنبانی بہ ساز
در نظر آتش درآید بس دراز

ایں درازی مدت از تیزیِ صنع
می نماند سرعت انگیزیِ صنع[۲]

توضیحات :

جو حکیمانہ بات رومی نے "بے صورتی" اور "صورت" (۲) کے حوالے سے کہی ہے ، وہ اقبال کے اشعار میں "نگاہ" اور "خاک" (۱) کے الفاظ سے ادا ہوئی ہے -

☆ ☆ ☆

۲- مثنوی : ۱ ، ص ۲۵ ، س ۲۸ تا ۳۱ -

۸۴

عقل ـ عاقل و معقول

اقبال

ابد را عقلِ ما ناسازگار است
'یکے' از گیر و دارِ او 'ہزار' است[1]

رومی

خود خرد آنست کو از حق چرید
نے خرد کانرا عطارد آورید
پیش بینیِ خرد تا گور بود
وانِ صاحبدل بنفخِ صور بود
ایں خرد از خاکِ گورے نگذرد
ویں قدم عرصۂ عجائب نسپرد

۱- زبور ، گلشن ، ص ۲۱۶ -

زین قدم وین عقل رو بیزار شو
چشمِ غیبی جوی و برخوردار شو
زین نظر وین عقل ناید جز دوار
پس نظر بگذار و بگزین انتظار[۲]

بندِ معقولات آمد فلسفی
شهسوارِ عقلِ عقل آمد صفی
عقل عقلت مغز و عقلِ تست پوست
معدۂ حیوان همیشہ پوست جو ست
مغز چون از پوست دارد صد ملال
مغزِ نغز آنرا حلال آمد حلال
چونکہ قشرِ عقل صد برہان دہد
عقلِ کل کے گام بے ایقان نہد
عقل دفترها کند یکسر سیاه
عقلِ عقل آفاق دارد پر ز ماه
از سیاهی وز سفیدی فارغ است
نورِ ماهش بر دل و جان بازغ است[۳]

۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۶۹ ، س ۸ تا ۱۰ -
۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۷۷ ، س ۲۴ تا ۲۶ -

عقل دو عقل است ، اوّل مکسبی
کہ در آموزی چو در مکتب صبی
از کتاب و اوستاد و ذکر و فکر
ارمغانے وز علومِ خوب و بکر
عقل تو افزوں شود بر دیگراں
لیک تو باشی ز حفظِ او گراں
عقلِ دیگر بخشش یزداں بود
چشمۂ او درمیانِ جاں بود
چوں زسینہ آب و آتش جوش کرد
نے شود گندہ ، نہ دیرینہ ، نہ زرد[۴]

گر ہزارانند ، یک کس بیش نیست
جز خیالاتِ عدداندیش نیست[۵]

توضیحات :

اقبال کا مصرع ”یکے از گیرو دارِ او ہزار است“ (۱) رومی کے مصرعے ”گر ہزارانند یک کس بیش نیست“ (۵) کی لفظی تجدید ہے۔

☆ ☆ ☆

۴۔ مثنوی : ۴ ، ص ۲۴۷ ، س ۱۳ تا ۱۵ ۔
۵۔ مثنوی : ۳ ، ص ۱۳۸ ، س ۱۸ ۔

۸۵

عقل اور عالمِ ظاہر

اقبال

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است

ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی است

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد

آشکارا عالمِ پندار کرد

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او

غیرِ او پیداست از اثباتِ او

در جہاں تخمِ خصومت کاشت است

خویشتن را غیرِ خود پنداشت است[1]

۱- اسرار ، ص ۱۲ -

رومی

عقل دیگر بخشش یزداں بود
چشمۂ او درمیان جاں بود[۲]

تاچہ عالم ہاست در سودائے عقل
تاچہ باپہناست ایں دریائے عقل
عقل پنہاں است و ظاہر عالمے
صورتِ ما موج یا از وے نمے[۳]

خلق بے پایاں زیک اندیشہ بیں
گشتہ چوں سیلے روانہ بر زمیں
ہست آں اندیشہ پیش خلق خورد
لیک چوں سیلے جہاں را خورد و برد
پس چو می بینی کہ از اندیشۂ
قایم است اندر جہاں ہر پیشۂ
خانہ ہا و قصر ہا و شہر ہا
کوہ ہا و دشت ہا و نہرہا
ہم زمین و بحر و ہم مہر و فلک
زندہ ازوے ہمچو از دریا سمک

۲- مثنوی : ۴ ، ص ۳۴۷ ، س ۱۵ -
۳- مثنوی : ۱ ، ص ۲۵ ، س ۱۰ ، ۱۲ -

پس چرا از ابلہی پیش تو کور
تن سلیمانست و اندیشہ چو مور[۴]

باغ ہا و سبزہ ہا در عین جان
بر بروں عکسش چو در آب رواں
آں خیال باغ باشد اندر آب
کہ کند از لطف آب آں اضطراب
باغ ہا و میوہ ہا اندر دل است
عکس لطف آں بریں آب و گل است
گر نبودے عکس آں سرّ و سرور
پس نخواندے ایزدش دارالغرور
ایں غرور آنست یعنی ایں خیال
ہست از عکس دل و جان رجال[۵]

توضیحات :

یہاں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ اقبال نے عالمِ خارج کو ''عالمِ پندار'' (۱) کہا ہے جو رومی کے الفاظ میں ''دارالغرور'' (۵) ہے - اسی طرح اقبال کے کلام میں ''صد جہاں'' (۱) رومی کے ''عالم ہا'' (۳) کے مقابل ہے -

☆ ☆ ☆

۴- مثنوی : ۲ ، ص ۹۵ ، س ۱۰ تا ۱۳ -
۵- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۷ ، س ۳۳ تا ۳۵ -

۸۶

عقل ـ عقلِ و علم

اقبال

عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اهرمنِ شعله زاد سجده کند خاک را[1]

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات
من به دوِ صرصرم من به غوِ تندرم
زابطۂ سالہات ، ضابطۂ آشہات
سوزم و سازے دہم آتشِ مینا گرم
ساختۂ خویش را در شکنم ریز ریز
تا ز غبارِ کہن پیکرِ نو آورم
پیکرِ انجم ز تو ، گردشِ انجم ز من
جاں بجہاں اندرم ، زندگیِ مضمرم

۱- پیام ، ص ۱۰۱ -

تو بہ بدن جاں دہی ، شور بجان من دہم

تو بہ سکوں رہ زنی ، من بہ تپش رہبرم[2]

روسی

خاتمِ ملکِ سلیمان است علم

جملہ عالم صورت و جان است علم

آدمی را زیں ہنر بے چارہ گشت

خلق دریا ہا و خلق کوہ و دشت

زو پلنگ و شیر ترساں ہمچو موش

زو شدہ پنہاں بہ دشت و کُہ وحوش

زو پری و دیو ساحلہا گرفت

ہر یکے در جائے پنہاں جا گرفت

آدمی را دشمنِ پنہاں بسے است

آدمیِ با حذر ، عاقل کسے است[3]

توضیحات :

اقبال نے پہلے شعر (۱) میں کہا ہے کہ انسان کی عقل ، علم کے ذریعے ''فطرتِ چالاک'' اور ''اہرمن شعلہ زاد'' کو تسخیر کر لیتی ہے - اس سے ذہن حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منتقل

۲- پیام ، ص ۹۸ -

۳- مثنوی : ۱ ، ص ۲۳ ، س ۲۶ - ۲۸ -

ہوتا ہے جن کے لیے ''ھوا'' جو ''فطرتِ چالاک'' کی مالک ہے، اور ''جنّ'' جو ''شعلہ زاد'' ہیں، اس طرح مسخر تھے کہ گویا ابلیس، جو ''اھرمنِ شعلہ زاد'' ہے، آدم کو، جو پیکرِ خاکی ہے، سجدہ کر رہا ہو۔ وہی ابلیس جس نے کہا تھا کہ میں آدم کو سجدہ کیوں کروں؟ مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے بنایا ہے۔

ساری مخلوق پر حضرت سلیمانؑ کی حکومت تھی۔ اسی طرح ذہن حضرت سلیمانؑ کے وزیر حضرت آصف برخیا کے واقعے کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے جنھوں نے حضرت سلیمانؑ کے فرمانے پر تختِ بلقیس چشم زدن میں دربار میں منگوا دیا تھا۔ قرآن پاک میں اس واقعے کے سلسلے میں حضرت آصف برخیا کا تعارف ان الفاظ میں ہے: ''من عندہ علم من الکتاب'' (وہ جسے کتابِ الٰہی کا کچھ علم حاصل تھا)۔

رومی نے کہا ہے ''خاتم ملک سلیمان است علم'' (۳) اور باقی اشعار میں انسان کی تسخیرِ کائنات کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ ساتھ ہی حضرتِ سلیمانؑ کی سلطنت و حکومت کی تصویر بھی نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

۸۷

علم ۔ تخلیقِ علم

اقبال

ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس
سینۂ او عرضۂ تیر است و بس
از کُنِ حق ماسوا شد آشکار
تا شود پیکانِ تو سندان گذار

خیز و واکن دیدۂ مخمور را
دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است
امتحانِ ممکناتِ مسلم است

جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن

علمِ ''اسماء'' اعتبارِ آدم است

حکمتِ اشیاءٔ حصارِ آدم است[1]

رومی

خاتمِ ملکِ سلیمان است علم

جملہ عالم صورت و جان ست علم

آدمی را زیں ھنر بےچارہ گشت

خلق دریا ھا و خلق کوه و دشت

زو پلنگ و شیر ترساں ھمچوموش

زو شده پنہاں بدشت و کُہ وحوش

زو پری و دیو ساحلہا گرفت

ہر یکے در جاے پنہاں جا گرفت[2]

توضیحات :

رومی نے علم کے وجود میں آنے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے علم کو ''خاتمِ ملکِ سلیمان'' (۲) کہا ہے ۔ اس صفت میں علم کا باعثِ عزت و وقار ہونا بھی مضمر ہے اور وسیلۂ حفظ و امان ہونا بھی ۔ اقبال نے ان مضمرات کو''اعتبار آدم''(۱) اور ''حصار آدم''(۱)

۱۔ رموز ، ص ۱۶۴ ، ۱۶۵ ، ۱۶۷ ، ۱۶۸ ۔

۲۔ مثنوی : ۱ ، ص ۲۳ ، ص ۲۶ ، ۲۷ ۔

کہہ کر نمایاں کر دیا ہے۔ رومی نے علم کی توصیف میں کہا ہے :

''آدمی را زیں هنر بیچاره گشت
خلق دریا ها و خلق کوه و دشت'' (۲)

اقبال نے علم کی اسی خصوصیت کی بنیاد پر انسان کو پیغام دیا ہے کہ علم کے ذریعے کائنات کو تسخیر کرے :

''انفس و آفاق را تسخیر کن'' (۱)

رومی نے کہا تھا ''بیچاره گشت'' (۲) یعنی مسخّر شد ۔

☆ ☆ ☆

۸۸

علم و عشق ۔ عقل و دل

اقبال

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد
زیرِ گردون رسمِ لا دینی نہاد

عقل و فکرش بے عیارِ خوب و زشت
چشمِ او بے نم دلِ او سنگ و خشت
علم ازو رسواست اندر شہر و دشت
جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاکِ نوعِ انسان سخت کوش
عقل اندر حکمِ دل یزدانی است
چوں ز دل آزاد شد ، شیطانی است[1]

۱۔ پس ، ص ۵۶ تا ۵۸ ۔

رومی

فلسفی گوید ز معقولات دون
عقل از دهلیز می‌ناید برون

فلسفی منکر شود در فکر و ظن
گو برو سر را بدان دیوار زن

نطقِ آب و نطقِ خاک و نطقِ گل
هست محسوسِ حواسِ اهل دل

فلسفی کو منکرِ حنّانه است
از حواسِ انبیا بیگانه است

گوید او که پرتو سودائے خلق
بس خیالات آورد در رائے خلق

بلکه عکس آن فساد و کفر او
این خیال منکرے را زد برو

فلسفی مر دیو را منکر بود
در همان دم سخرهٔ دیوے شود

گر ندیدی دیو را خود را ببین
بے جنون نبود کبودے بر جبین

هر کرا در دل شک و پیچانی است
در جهان او فلسفی پنهانی است

می نماید اعتقاد او گاه گاه
آن رگِ فلسف کند رویش سیاه[٢]

فلسفی خود را ز اندیشہ بکشت
گو بدو کو را سوے گنج است پشت
گو بدو چندانکہ افزوں میدود
از مرادِ دل جدا تر می شود[٣]

داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی زابلیس و عشق از آدم است
زیرکی سبّاحی آمد در بحار
کم رهد ، غرق است او پایانِ کار
عشق چوں کشتی بود بهرِ خواص
کم بود آفت ، بود اغلب خلاص
زیرکی بفروش و حیرانی بخر
زیرکی ظنّست و حیرانی نظر
عقل را قرباں کن اندر عشق دوست
عقلها بارے ازاں سویست کوست

٢- مثنوی : ١ ، ص ٦٥ ، س ١٦ تا ٢٠ -
٣- مثنوی : ٦ ، ص ٣٨٧ ، س ١٦ -

عقل‌ها آں سو فرستادہ عقول

ماندہ ایں‌سو آنکہ کول است و فضول[۴]

توضیحات :

اقبال کا یہ کہنا :

''یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد''(۱)

رومی کے اس قول کے ساتھ کس قدر متوازی ہے :

''فلسفی خود را ز اندیشہ بکشت''(۳)

اسی طرح اقبال کا یہ تبصرہ :

''دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش

در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش(۱)

رومی کے اس ارشاد کے ساتھ کتنا ہم آہنگ ہے :

''زیرکی سبّاحی آمد در بحار

کم رہد ، غرق است او پایانِ کار''(۴)

اقبال نے ''جبرئیل'' کے ''ابلیس'' اور ''عقلِ یزدانی'' کے ''عقلِ شیطانی'' (۱) بن جانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ رومی نے کہا ہے کہ ''فلسفی'' ''سخرۂ دیو (شیطان)'' (۲) بن جاتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے کہ ''عقل'' ''دل'' کی تابع ہے تو ''یزدانی'' (۱) ہے ، رومی نے ''اہل دل''(۲) کے بالاتر شعور کی فعّالیت بیان کی ہے اور حواسِ انبیا[۴] کا ذکر کیا ہے۔ اقبال نے بتایا ہے کہ ''عقل'' کے ''دل'' سے ''آزاد''

۴۔ مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۸ ، س ۱۹ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۳۱ ۔

ہو جانے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے (۱) - رومی نے ''فلسفی'' کے ''مرادِ دل'' سے برابر دور ہوتے رہنے کا سبب واضح کیا ہے (۳) -

اقبال کے یہ الفاظ :

''چشمِ او بے نم دلِ او سنگ و خشت''

مغرب کی عشق سے محرومی کی تصویر پیش کرتے ہیں - رومی کا پیغام ہے :

''عقل را قرباں کن اندر عشقِ دوست'' (۴)

☆ ☆ ☆

۸۹

عمل ۔ دوامِ جدّتِ عمل

اقبال

زندگانی را سرِ تکرار نیست
فطرتِ او خوگرِ تکرار نیست

زندگانی نیست تکرارِ نفس
اصلِ او از حیّ و قیوّم است و بس[۱]

رومی

خلق را چون آب دان صاف و زلال
وندرو تابان صفاتِ ذوالجلال[۲]

چونکہ ہر جزوے بجوید ارتفاق
چون بود جانِ عزیز اندر فراق

۱- جاوید ، ص ۲۲۶ -
۲- مثنوی : ۶ ، ص ۳۹۹ ، س ۶ -

گوید ، اے اجزاے پستِ فرشیم
غربتِ من تلخ تر ، من عرشیم
میلِ جاں اندر حیات و در حی است
زانکہ جانِ لامکاں اصل وے است[۳]

اتصالے بے تکیّف ، بے قیاس
ہست جانِ ناس را با ربِ ناس[۴]

بحثِ جاں اندر مقامِ دیگر است
بادۂ جاں را قوامِ دیگر است[۵]

تا تو تن را چرب و شیریں میدھی
جوھرِ جاں را نہ بینی فربہی[۶]

قوتِ اصلیِ بشر نورِ خداست
قوتِ حیوانی مر او را ناسزاست[۷]

توضیحات :

ملاحظہ ہو توضیح زیرِ عنوان شمارہ ۹۸ : ''عمل ، نو آفرینی'' - ص ۳۴۵ -

---

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۲۰۸ ، س ۳۴ ، ۳۵ -
۴- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۸ ، س ۲۵ -
۵- مثنوی : ۱ ، ص ۳۲ ، ۲۱ -
۶- مثنوی : ۲ ، ص ۸۳ ، س ۲۵ -
۷- مثنوی : ۲ ، ص ۹۵ ، س ۲۱ -

۹۰

عمل ۔ دوامِ ذوقِ طلب

اقبال

دوامِ حق جزائے کارِ او نیست

کہ او را ایں دوام از جستجو نیست

دوام آں بہ کہ جانِ مستعارے

شود از عشق و مستی پایدارے[1]

رومی

ذوق دارد ہر کسے در طاعتے

لاجرم نشکیبد از وے ساعتے[2]

۱- زبور ، ص ۲۳۷ -

۲- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۱ ، س ۳۳ -

ذوق باید تا دهد طاعات بر
مغز باید تا دهد دانہ شجر[۳]

آب کم جو ، تشنگی آور بدست
تا بجوشد آبت از بالا و پست
تا سقاهم ربہم آید خطاب
تشنہ باش ، اللہ اعلم بالصواب[۴]

ایں طلب مفتاحِ مطلوباتِ تست
ایں سپاہِ نصرت و راياتِ تست[۵]

توضیحات :

اقبال نے یہاں جس حالت و کیفیت کو ''عشق و مستی'' (۱) سے تعبیر کیا ہے ، رومی نے اسے ''ذوق'' (۳) ، 'تشنگی' (۴) اور ''طلب'' (۵) کہا ہے -

☆ ☆ ☆

۳- مثنوی : ۲ ، ص ۱۳۱ ، س ۱ -
۴- مثنوی : ۳ ، ص ۱۸۹ ، س ۵ ، ۹ -
۵- مثنوی : ۳ ، ص ۱٦۰ ، س ۱ -

۹۱

عمل ۔ دوامِ سعی و طلب

اقبال

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
ای پیکرِ گل ، کوششِ پیہم کی جزا دیکھ[1]

رومی

منگر این را کہ حقیری یا ضعیف
بنگر اندر همّتِ خود ، اے شریف
تو بہر حالے کہ باشی ، می طلب
آب میجو دایما ، اے خشک لب

۱- بال ، ص ۱۷۹ -

کاں لبِ خشکت گواهی میدهد
کہ بہ آخر بر سرِ منبع رود
خشکیِ لب هست پیغامے ز آب
کہ بمات آرد یقیں ایں اضطراب
کایں طلبگاری مبارک جنبشے است
ایں طلب در راه حق، مانع کشے است[۲]

چوں نهادی در طلب پا ، اے پسر
یافتی و شد میسّر بے خطر
هیں مباش اے خواجہ یکدم بے طلب
تا بیابی هرچہ خواهی ، اے عجب
عاقبت جوینده یابنده بود
چونکہ در خدمت شتابنده بود[۳]

جهد کن تا نورِ تو رخشاں شود
تا سلوکِ ایں رهت آساں شود[۴]

۲- مثنوی : ۳ ، ص ۱۵۹ ، س ۴۳ - ۴۴ - ص ۱۶۰ ، س ۱ -
۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۶۰ س ۶ ، ۷ -
۴- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۱ ، س ۱۶ -

توضیحات :

اقبال کا مصرع :

''خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں'' (۱)

رومی کے اس مصرعے کے ساتھ :

''جہد کن تا نورِ تو رخشاں شود'' (۲)

کس قدر ہم‌آہنگ ہے! یہ دونوں مصرعے انسان کی ارتقا پذیر صلاحیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دونوں مصرعوں میں اس حقیقت کو نور کی علامتوں سے واضح کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

۹۲

عمل ۔ سعیِ دوام

اقبال

اگر چشمے کشائی بر دلِ خویش

درونِ سینہ بینی منزلِ خویش

سفر اندر حضر کردن چنین است

سفر از خود بخود کردن همین است

مجو پایاں کہ پایانے نداری

بہ پایاں تا رسی ، جانے نداری

بہ پایاں نارسیدن زندگانی است

سفر ما را حیاتِ جاودانی است[1]

رومی

اینچنیں معدوم کو از خویش رفت

بہتریںِ هست ها افتاد زفت

۱۔ زبور ، ص ۲۳۱ ۔

او بہ نسبت با حیاتِ حق فناست
در حقیقت در فنا او را بقاست[۲]

کایں تحرّک شد تبرّک را کلید
وز تحرّک گردی ، اے دل مستفید[۳]

پیشِ بیحد ہرچہ محدوداست لاست
کل شیءٍ غیر وجہ اللہ فناست
ایں فنا ہا پردۂ آں وجہ گفت
چوں چراغ خفتہ اندر زیر طشت[۴]

تو از آں روزے کہ در ہست آمدی
آتشے یا باد یا خاکی بدی
گر بر آں حالت ترا بودے بنا
کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا
از مبدّل ہستیِ اوّل نماند
ہستیِ بہتر بجاے آں نشاند

۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۲۲ ، س ۱۷ -
۳- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۷ ، س ۹ -
۴- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۹ ، س ۳۰ ، ۳۱ -

همچنین تا صد هزاران هستها
بعد یک دیگر دوم به ز ابتدا
از مبدّل بین وسایط را بمان
کز وسایط دور گردی ز اصلِ آن
واسطه هر جا فزون شد وصل جست
واسطه کم ذوق و وصل افزون ترست
از سبب دانی شود کم حیرتت
حیرتِ تو ره دهد در حضرتت
این بقاها از فناها یافتی
از فنا پس رو چرا برتافتی
زان فناها چه زیان بودت که تا
بر بقا چفسیده ای اے بینوا
چون دوم از اولینت بهتر ست
پس فنا جو و مبدّل را پرست
صد هزاران حشر دیدی اے عنود
تا کنون هر لحظه از بدوِ وجود
از جمادی بے خبر سوے نما
ور نما سوے حیات و ابتلا
باز سوے عقل و تمییزات خوش
باز سوے خارجِ این پنج و شش

تا لبِ بحر این نشانِ پایهاست-
پس نشانِ پا درونِ بحر لاست

باز منزل هاے خشکی ز احتیاط
هست دیہ‌ها و وطن ها و رباط

باز منزل هاے دریا در وقوف
وقت موج و حبس بے عرصہ و سقوف

نیست پیدا آن مراحل را سنام
نے نشانست آن منازل را، نہ نام

هست صد چندان میان منزلین
آن طرف کہ از نما تا روحِ عین

در فناها این بقاها دیده ای
بر بقاے جسم چون چفسیده ای[5]

نردبانهائیست پنهان در جهان
پایہ پایہ تا عنانِ آسمان

هر کره را نردبانے دیگر است
هر روش را آسمانے دیگر است[6]

۵- مثنوی : ۵، ص ۲۹۲، س ۲ تا ۱۱ -
۶- مثنوی : ۵، ص ۳۲۲، س ۳۴، ۳۵ -

آمده اوّل بہ اقلیمِ جماد
از جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد
وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چون بحیوان اوفتاد
نامدش حالِ نباتی، هیچ یاد
جز همان میلے کہ دارد سوئے آن
خاصہ در وقتِ بہار و ضیمران
باز از حیوان سوے انسانیش
میکشد آن خالقے کہ دانیش
همچنیں زاقلیم تا اقلیم رفت
تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقلہاے اوّلینش یاد نیست
هم ازیں عقلش تحوّل کردنیست
تا رهد زیں عقل پُر حرص و طلب
صد هزاران عقل بیند بوالعجب[۷]

۷- مثنوی : ۴، ص ۲۷۴، س ۱۱ تا ۱۳، ۱۶، ۱۷ -

توضیحات :

ارتقا کی سعی دوام کو اقبال نے ''سفر'' (۱) سے تعبیر کیا ہے ، رومی نے ''تحرّک'' (۲) کہا ہے اور اس کے مراحل کی تصویر کشی کی ہے ۔

☆ ☆ ☆

۹۳

عمل ۔ مضرّتِ وہم و خیال اور اہمیتِ عمل

اقبال

بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود
جانِ او وارفتۂ معدوم بود
قوم ہا از سکرِ او مسموم گشت
خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت[1]

رومی

علم را دو پر گماں را یک پر است
ناقص آمد ظن ، بہ پرواز ابتر است[2]

۱- اسرار ، ص ۳۵ ، ۳۶ -
۲- مثنوی : ۳ ، ص ۱۶۱ ، س ۱۱ -

عقلِ جزوی آفتش وہم است و ظن
زانکہ در ظلمات شد او را وطن[۳]

عالمِ وہم و خیال و طبع و بیم
ہست رہرو را یکے سدِ عظیم[۴]

صد ہزاراں کشتیِ با ہول و سہم
تختہ تختہ گشتہ در دریاے وہم
چوں ترا وہمِ تو دارد خیرہ سر
از چہ گردی گردِ وہم ، اے بیخبر[۵]

ہر درونے کو خیال اندیش شد
چوں دلیل آری ، خیالش پیش شد
چوں سخن در وے رود ، علت شود
تیغِ غازی دزد را آلت شود
پس جوابِ او سکوت است و سکوں
ہست با ابلہ سخن گفتن جنوں[۶]

۳- مثنوی : ۳ ، ص ۱۶۲ ، س ۵ -
۴- مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۴ ، س ۱۶ -
۵- مثنوی : ۵ ، ص ۳۲۴ ، س ۲۲ ، ۲۳ -
۶- مثنوی : ۲ ، ص ۱۲۰ ، س ۳۹ - ۴۰ -

قالِ بد رنجور گرداند همے
آدمی را کہ نبودستش غمے
قولِ پیغمبر قبولہ یفرض
ان تمارضتم لدینا تمرضوا[۷]

توضیحات :

افلاطون کے بارے میں اقبال نے اپنے ان اشعار (۱) میں وہم و خیال کی مذمّت کی ہے ، اور بتایا ہے کہ تخیّلات اور توہّمات ذوقِ عمل سے محروم کر دیتے ہیں - رومی نے عالمِ وہم و خیال کو ''رہرو'' کے لیے ''سدِّ عظیم'' (۲) قرار دیا ہے اور یہ عمل اور ذوقِ عمل سے محرومی کی انتہائی مؤثر تصویر ہے -

☆ ☆ ☆

۷- مثنوی : ۳ ، ص ۱۶۲ ، س ۱۹ -

۹۴

عمل ۔ سرگرمیِ عمل

اقبال

اے خداوندِ صواب و ناصواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب!
ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس ست
مشتِ خس را یک شرار ازمن بس ست[1]

اندریں عالم اگر جز خس نبود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ
سوے آں مردِ خدا راہم بدہ
اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست!
لذّتے شاید کہ یابم در شکست[2]

۱- جاوید، ص ۱۶۰ -
۲- جاوید، ص ۱۶۱ -

رومی

گفت ، یارب بیش ازیں خواهم مدد
تا ببندم شاں بحبلِ من مسد
تاکہ مستانت کہ نر و پردل اند
مرد وار این بندها را بگسلند
تا بدیں دام و رسن ہائے هوا
مردِ تو گردد ز نامرداں جدا
دامِ دیگر خواهم ، اے سلطانِ تخت
دام مرد انداز حیلت ساز سخت
خمر و چنگ آورد و در پیشش نہاد
نیم خندہ زد ، بداں شد نیم شاد
سوئے اضلالِ ازل پیغام کرد
کہ برآر از قعر بحر فتنہ گرد
نے یکے از بندگانت موسی است
پردہ ها در بحر او از گرد بست
دام محکم دہ کہ تا گردد تمام
وافگنم در کام ایشاں چوں لجام[۳]

توضیحات :

اس سیاق میں اقبال نے جسے ''مردِ خدا'' (۲) کہا ہے ،

۳- مثنوی : ۵ ، ص ۲۹۳ ، س ۲۳ - ۲۷ -

رومی نے ابلیس کے خدا سے خطاب میں اسے ''مردِ تو'' (۳) کہا ہے ۔ اقبال کے اشعار میں ہے ''زندہ مردِ حق پرست'' (۲) ، رومی کے اشعار میں ہے ''مستانِ نـَر و پـُردل'' (۳) ۔ بات ایک مشترک مفہوم تک پہنچتی ہے ۔ رومی کے ہاں ابلیس کے لیے لفظ ''نیم شاد'' (۳) آیا ہے ۔ اس میں جو ایمائیت ہے وہ اقبال کے الفاظ ''لـّذتے در شکست'' (۲) میں واضح ہوگئی ہے ۔ ابلیس خوش بھی ہے اور خوش نہیں بھی ہے ۔ خوش نہیں ہے کیونکہ شکست ہوئی اور خوش بھی ہے اس لیے کہ اس شکست میں ایک لذت محسوس کر رہا ہے ۔

۹۵

عمل ۔ لذتِ کردار

اقبال

زشت و نکو زادۂ وہمِ خداوندِ تست
لذتِ کردار گیر ، گام بنہ ، جوے کام[1]

رومی

چون قضا آورد حکم خود پدید
چشم وا گشت و پشیمانی رسید
آن پشیمانی قضاے دیگر است
پس پشیمانی بہل ، حق را پرست
ور کنی عادت ، پشیمان خور شوی
زان پشیمانی ، پشیمان تر شوی
نیم عمرت در پریشانی رود
نیم دیگر در پشیمانی شود

۱- پیام ، ص ۸۹ -

ترکِ این فکر و پشیمانی بگو

حالِ کاروبارِ نیکو تر بجو[۲]

بیخِ عمرت را بده آبِ حیات

تا درختِ عمر گردد با ثبات

جمله ماضیها ازین نیکو شوند

زهرِ پارینه ازین گردد چو قند[۳]

همچو آدم[۴] زلّتش عاریة بد

لاجرم اندر زمان در توبه شد

چونکه اصلی بود جرمِ آن بلیس

ره نبودش جانبِ توبه نفیس[۴]

گفت احمد هر که دو روزش یکیست

همچو مغبون ، او گرفتارِ شکیست[۵]

۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۳۷ ، س ۱۹ تا ۲۱ -

۳- مثنوی : ۵ ، ص ۳۱۶ ، س ۲۱ ، ۲۲ -

۴- مثنوی : ۴ ، ص ۲۷۰ ، س ۳۶ -

۵- مثنوی : ۶ ، ص ۴۲۵ ، س ۳۹ -

توضیحات :

اقبال نے سرگرمیِ عمل پر زور دیتے ہوئے کہا ہے :

''لـذتِ کردار گیر ، گام بنہ ، جوی کام'' (۱)

رومی نے یہی پیغام یوں دیا ہے :

''حِال کاروبار نیکو تر بجو'' (۲)

اقبال نے ''زشت و نکو'' (۱) کے احساس کی رکود و جمود پیدا کرنے والی کیفیت سے بچنے کی ہدایت کی ہے - رومی نے اسی مقصد سے ''پریشانی'' اور ''پشیمانی'' (۲) سے بچانا چاہا ہے -

☆ ☆ ☆

۹۶

عمل ۔ ندرتِ عمل

اقبال

گر از دستِ تو کارِ نادر آید

گناہے ہم اگر باشد، ثواب است[1]

رومی

عالمے اندر ہنرہا خود نماست

ہمچو عالم بے وفا وقتِ وفا است

وقت خود بینی نگنجد در جہاں

در گلو و معدہ گم گشتہ چو ناں

ایں ہمہ اوصاف شاں نیکو شود

بد نماند چونکہ نیکو جو شود[2]

۱۔ پیام، ص ۶۲ ۔

۲۔ مثنوی : ۶، ص ۳۵۳، س ۳۲، ۳۳ ۔

گر منی گنده بود همچون منی
چون بجان پیوست گردد روشنی
هر جمادے کو کند رو در نبات
از درختِ بختِ او روید حیات
هر نباتے کو بجان رو آورد
خضروار از چشمۂ حیوان خورد
باز چون جان رو سوے جانان نهد
رخت را در عمرِ بے پایان نهد[۳]

هر نفس نو می شود دنیا و ما
بے خبر از نو شدن اندر بقا
عمر همچون جوے نو نو میرسد
مستمرے می نماید در جسد[۴]

در وجودِ آدمی جان و روان
می رسد از غیب چون آبِ روان
هر زمان از غیب نو نو می‌رسد
وز جهانِ تن برون شو می رسد[۵]

۳- مثنوی : ۶ ، ص ۲۵۳ ، س ۳۳ - ۳۵ -
۴- مثنوی : ۱ ، ص ۲۵ ، س ۲۹ - ۳۰ -
۵- مثنوی : ۱ ، ص ۴۵ ، س ۲۰ -

توضیحات :

اقبال کے مصرعے :

''گناہے ہم اگر باشد ثواب است'' (۱)

کو رومی کے مصرعے :

''بد نماند چونکہ نیکو جو شود'' (۲)

کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے -

☆ ☆ ☆

۹۷

عمل ۔ ندرتِ فکر و عمل

اقبال

کہن گشتند ایں خاکی نہاداں
دگر آدم بنا کن از گلِ ما[1]

رومی

ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
نے کہ اول کہنہ را ویراں کنند[2]

۱- پیام ، ص ۵۶ -
۲- مثنوی : ۴ ، ص ۲۵۳ ، س ۱۷ -
(دوسرا مصرع بعض نسخوں میں یوں ہے :
اول آں بنیاد را ویراں کنند
اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس بیت کی تضمین دوسرے مصرعے کے الهی الفاظ کے ساتھ کی ہے :
گفت رومی ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند
(ـــ بانگ ، ص ۳۰۰)

توضیحات :

رومی نے تجدیدِ کردار اور "وجود در عدم" کی حقیقت ، عمارت کے انہدام اور تعمیر کی مثال سے واضح کی تھی - اقبال نے بھی یہی پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے -

☆ ☆ ☆

۹۸

عمل ۔ نوآفرینی

اقبال

دم بدم نوآفرینی کارِ حر
نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حر
فطرتش زحمت کشِ تکرار نیست
جادۂ او حلقۂ پرکار نیست[1]

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے
تپد آں زماں دلِ من پے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ، ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے ، بہ دلِ امیدوارے[2]

۱- اسرار ، ص ۸۲ -
۲- پیام ، ص ۱۲۸ ، ۱۲۹ -

رومی

خلق را چوں آب داں صاف و زلال
واندرو تاباں صفاتِ ذوالجلال[۳]

هر نفس نو می شود دنیا و ما
بے خبر از نو شدن اندر بقا[۴]

کُلَّ یومٍ هوَ فی شانٍ بخواں
مر ورا بے کار و بے فعلے مداں[۵]

کارگاه صنعِ حق در نیستی است
غرّهٔ هستی چه داند نیست چیست[۶]

آینهٔ هستی چه باشد نیستی
نیستی بگزیں ، گر ابله نیستی
هستی اندر نیستی بتواں نمود
مال داراں بر فقیر آرند جود[۷]

۳- مثنوی : ۶ ، ص ۳۹۹ ، س ۶ -
۴- مثنوی : ۱ ، ص ۲۵ ، س ۲۹ -
۵- مثنوی : ۱ ، ص ۶۱ ، س ۲۹ -
۶- مثنوی : ۳ ، ص ۲۱۰ ، س ۱۳ -
۷- مثنوی : ۱ ، ص ۶۴ ، س ۴ ، ۵ -

جملہ اجزائے جہاں زاں حکمِ پیش
جفت جفت و عاشقانِ جفتِ خویش[۸]

ذرہ ذرہ کاندریں ارض و سماست
جنسِ خود را ہمچو کاہ و کہرباست[۹]

نسبتِ ایں فرع ہا با اصل ہا
ہست بیچوں ارچہ دادش وصلہا[۱۰]

توضیحات :

ذات الٰہی کی تجلیات میں محدودیت نہیں، تعطل نہیں ، تکرار نہیں ۔ محی الدین ابن العربی کی ''فصوص الحکم'' نے تصوّف و عرفان کے پورے ادب میں اس نکتے کو عام کر دیا ۔ اس کا ماخذ قرآن پاک کی وہ آیۂ مبارکہ ہے جو رومی کے شعر (۵) کی اساس ہے ۔ اسی کی بنیاد پر رومی نے انسان کو ارتقائے حیات و کائنات کی طرف متوجہ کیا اور یہ کہہ کر ''ہر نفس نو می شود دنیا . . .'' (۴) نوآفرینی کا پیغام دیا تاکہ سعیِ انسانی اس ناموسِ فطرت اور قانونِ قدرت سے ہم آہنگ رہے ۔ یہی لفظ ''نو'' لے کر اقبال نے فرمایا : ''دم بدم نو آفرینی کارِ حر'' (۱) تجدّدِ امثال اور حرکتِ جوہری کے تصورات بھی ارتقا کے اس عقیدے کے ساتھ رہے اور ہر زیاں میں سود اور ہر عدم میں وجود کے تصوّر کا سرچشمہ بنے ۔

☆ ☆ ☆

۸- مثنوی : ۳ ، ص ۲۰۸ ، س ۱۴ ۔
۹- مثنوی : ۶ ، ص ۳۹۵ ، س ۶ ۔
۱۰- مثنوی : ۴ ، ص ۲۵۴ ، س ۱۹ ۔

مثنوی رومی کے حوالوں کا اشاریہ

(ہم نے اس کتاب میں مثنوی رومی کے حوالے جس نسخے سے دیے ہیں اس کے علاوہ دوسرے مطبوعہ یا قلمی نسخوں میں متعلقہ اشعار تلاش کرنے کے لیے ذیل کا اشاریہ مدد دے گا۔ اس اشاریے میں مثنوی کا دفتر، صفحہ اور سطر بتا کر، جس کا حوالہ ہم نے کتاب کے حواشی میں دیا ہے، اُن عنوانات کی نشان دہی کی گئی ہے جن کے تحت متعلقہ اشعار مثنوی میں آتے ہیں۔ حوالوں کے اندراجات کی ترتیب مثنوی کے چھ دفتروں کی ترتیب اور ہر دفتر کے صفحات کی ترتیب کے مطابق ہے)۔

دفترِ اول

صفحہ	سطر	عنوان
۲	۲، ۴، ۱۳ ×	(آغازِ دفتر)
	۱۶، ۱۷	
۴	۲۹، ۳۲	بردنِ پادشاہ طبیب را برسرِ بیمار . . .
۷	۵	فرستادنِ پادشاہ رسولان بہ سمرقند . . .

دفترِ دوم

دفترِ سوم

صفحه	سطر	عنوان
۲۳۳	۵ تا ۷	بقیه قصهٔ عمارت کردن سلیمان[۴] مسجد اقصیٰ را . . .
۲۳۴	۳۷	باز آمدن شاعر بعد از چند سال . . .
۲۳۵	۱، ۱۱	باز آمدن شاعر بعد از چند سال . . .
۲۳۶	۹	مانستن بدرائی این وزیر دون . . .
۲۳۷	۱۹ تا ۲۱	آموختن پیشهٔ گورکنی قابیل از زاغ . . .
۲۳۷	۳۳ تا ۳۵	قصهٔ صوفی که درمیان گلستان . . .
۲۳۸	۱۹، ۲۱، ۲۲، ۳۰، ۳۱	قصهٔ رستن خروب درگوشهٔ مسجد اقصیٰ . . .
۲۴۰	۲۹	چالیش عقل با نفس . . .
۲۴۲	۲۷	خطاب بامغروران دنیا . . .
۲۴۴	۱۳	حکایت آن مداح که از جهت ناموس . . .
۲۴۶	۱	باز گشتن بحکایت غلام ـ
۲۴۷	۱۳ تا ۱۵	ستودن پیغمبر علیه السلام عاقل را . . .
۲۵۰	۳۰، ۳۱	علامت عاقل تمام و نیم عاقل . . .
۲۵۳	۱۷	بیان آنکه عمارت در ویرانی است . . .

(و - ح - م)